British Pakistani
Psychiatrists Association

BPPA

نامہ

2022

thebppa.org.uk

BPPA Chairmen 2000 to date

Dr Akmal Makhdum 2000 - 2006
Dr Hasan Jawed 2006 -2009
Dr Anjum Bashir 2009 - 2012
Dr Mateen Durrani 2012 - 2015
Dr Shahid Quraishi 2015 - 2018
Dr Qaiser Abbas Zaidi 2018 - 2021
Dr Shahid Latif 2021 to date

Chairman
BPPA

Dear BPPA members,
It is of immense pleasure that the "BPPA Nama 2022" is back with us, a tradition revived. I wish to congratulate the team led by Dr. Qaiser Zaidi and the BPPA executives who have worked to resurrect it. I invite you all to contribute towards your own BPPA Nama so that we can make it a regular feature.

Celebrating the past and looking forward to the future of BPPA with much enthusiasm.

Best wishes
Dr. Shahid Latif
Chairman BPPA

Secretary
BPPA

It was a late thought but we managed to bring out, after many years of absence, BPPA Nama 2022. I am grateful to the team and the contributers who made this possible.

Please read, enjoy and give feedback Yours very truly

Ria's Irfan
General Secretary BPPA

عرضِ مدیر

مجھے جہاں تک یاد ہے آخری بار ''بی پی پی اے نامہ'' کی صورت مجھے اُس زمانے میں نظر آئی تھی جب ڈاکٹر انجم بشیر صاحب بی پی پی اے کے چیئرمین تھے، شاید ۲۰۱۰ کی بات ہے۔ اُس کے بعد یہ خواہش تو سب کی رہی کہ بی پی پی اے نامہ ایک مرتبہ پھر منظرِ عام پر آئے مگر ایسا ممکن نہ ہو سکا۔ اس بار ۱۹ اکتوبر کو محترم ڈاکٹر رئیس عرفان صاحب نے ایک چھوٹا سا واٹس اپ میسج بھیج کر مجھ سے یہ پوچھا کہ کیا سالانہ کانفرنس تک ''بی پی پی اے نامہ'' کا اجراء ممکن ہے تو مجھے خوشی بھی ہوئی مگر وقت کی کمی کا احساس بھی ہوا۔ میں نے بہر حال اللہ کا نام لے کر حامی بھر لی۔ یہ سہرا بھی قدرت کو شاید ڈاکٹر شاہد لطیف کے سر ہی باندھنا تھا یوں اللہ کی مدد اور دوستوں کے تعاون سے ''بی پی پی اے نامہ ۲۰۲۲'' حاضرِ خدمت ہے۔ مقدور بھر کوشش کی ہے کہ اس کاوش کو علمی اور ادبی حوالے سے معتبر مقام حاصل ہو مگر یہ خیال بھی رکھا گیا ہے کہ نوجوان لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی میں کوئی کمی نہ ہو۔ اُردو مرکز لندن کے چیئرمین ڈاکٹر جاوید شیخ صاحب کی کتاب ''کچھ میرے ہم نشیں'' سے ایک اقتباس مشتاق یوسفی کے حوالے سے اور ناصر کاظمی صاحب کے فرزند باصر سلطان کاظمی ایم بی ای کے قلم سے نکلی ہوئی ایک تحریر اور ان کی ایک غزل اس شمارے کی زینت ہے۔ اس مختصر وقت میں جو ممکن ہو سکا وہ آپ کے سامنے ہے۔

گر قبول افتد زہے عز و شرف
ڈاکٹر قیصر عباس زیدی

فہرست

1 مشتاق احمد یوسفی 03
تحریر ڈاکٹر جاوید شیخ

2 ناصر کاظمی کا مثالی معاشرہ 09
تحریر ۔ باصر سلطان کاظمی

3 ٹیپو سلطان کے پانچ خواب 13
تحریر (مترجم محمد اکمل مخدوم)

4 خودکشی 16
ذہنی امراض اور دفعہ 335 میں ترمیم
چند گذارشات۔ تحریر ڈاکٹر افتخار احمد

5 غزل باصر سلطان کاظمی 21

6 غزل 22
ڈاکٹر قیصر عباس زیدی

7 اقبال کے نام 23
ڈاکٹر قیصر عباس زیدی

8 غزلیات ڈاکٹر اکمل مخدوم 24

9 غزل ڈاکٹر مقصود احمد 26

10 سوچاں ڈاکٹر مقصود احمد 27

11 نثری نظم ڈاکٹر سعدیہ محمد 28

12 شاعرانہ اظہار خیال ڈاکٹر سعدیہ محمد 29

13 Time to go back to the couch. 30
by Professor Tanveer Rana

14 اسلامی نظام حکومت 39
از مولانا ابو العلی مودودی
تنقیدی مکالمہ از محمد اکمل مخدوم

محترم یوسفی صاحب

تحریر ڈاکٹر جاوید شیخ

انسانی رشتے بھی عجیب ہوتے ہیں ۔ کوئی بات مشترک نہ ہونے کے باوجود آپ ایک دوسرے سے ایسے بندھ جاتے ہیں جیسے دل سے دھڑکن ۔ یوسفی صاحب بھی ایک ایسی ہی شخصیت تھے جن سے تعظیم ومحبت افتخار وشفقت کا ایسا بندھن بندھا جو میرے مرتے دم تک اٹوٹ رہے گا۔
موصوف میں اتنی خوبیاں تھیں کہ میں ان کا شمار کروں تو کر نہ پاؤں ۔

پہلی دفعہ افتخار بھائی (افتخار عارف صاحب میرے اصرار پر مجھے لے کر یوسفی صاحب کے گھر گئے ۔ یہ 1980ء کی دہائی کی بات ہے۔ St. John's Wood کے علاقے میں ان کا ایک شاندار فلیٹ تھا جو لارڈز کرکٹ گراؤنڈ کے بالکل قریب ہے ۔ایک چھوٹے سے کمرے میں جہاں یوسفی صاحب زیادہ تر وقت گزارتے تھے ہمیں بٹھا دیا گیا۔ اس میں کتابیں بجری ہوئی تھیں ۔ یہ یوسفی صاحب کی Study یا لائبریری تھی ۔ شیلفوں میں سلیقے سے کتابیں چنی گئی تھی ۔ زیادہ تر کتابیں انگریزی میں تھیں ۔ چند انگریزی شاعری پر بھی تھیں ۔ان کتابوں سے یوسفی صاحب کے ذوق وشوق کا اندازہ ہوتا تھا۔ میز پر سلیقے سے کاغذ رکھے ہوئے تھے قلم پنسل پنسل تراشنے والا آلہ اور ربر بھی تھا۔ ایک فاؤنٹین پن بھی تھا۔ یوں لگ رہا تھا کہ کوئی مضمون تحریری شکل پارہا ہے ۔

عموماً میں نے ادیب اور شاعروں کو لکھتے دیکھا ہے ۔ان کی میز کی ترتیب میری میز سے بھی بدتر ہوتی ہے مگر پہلی ہی ملاقات میں ایسا تخلیقی سلیقہ دیکھ کر میں مرعوب ہو گیا۔ اس وقت تک میں صرف چراغ تلے پڑھ پایا تھا۔ افتخار بھائی نے میرا تعارف کروایا۔ یوسفی صاحب نے بے اعتنائی سے مجھے بیٹھے کو کہا اور اس کے بعد سوا گھنٹہ افتخار بھائی اور یوسفی صاحب کی باتیں ہوتی رہیں مختلف موضوعات پر مثلاً لندن میں مختلف لوگوں کی حرکات وسکنات جن سے میں بھی واقف تھا مگر ہمت نہ پڑی کہ میں کچھ کہ سکوں ۔ یونی صاحب سے مرعوبیت کی وجہ سے میں نے دخل در معقولات نہ کیا اور صرف بیٹھا نا کیا۔ اس گفتگو میں داغ دہلوی کی شاعری اور ان کے ہم عصر لوگوں کے تاثرات پر بھی بات ہوئی ۔ داغ کے ناشائستہ طفل ہونے کا تذکرہ بھی ہوا۔ یعنی میری معلومات میں زبان سے ایک لفظ نکالے بغیر خوب اضافہ ہوا۔ مجھے حیرت اس بات پر تھی کہ یوسفی صاحب نثر کو ہونے کے باوجود شاعری کے بارے میں اس قدر جانتے ہیں ۔ مجھے یوں لگا جیسے انہوں نے ولی دکنی سے لے کر افتخار عارف تیک کو بڑی دلچسپی سے پڑھ رکھا ہے ۔ میرے پیشے میں تو کوئی اگر اسپیشلسٹ اپنے شعبے کے علاوہ کسی چیز سے واقف ہوتو اسے جھتی سمجھا جا تا ہے ۔ادب میں مطالعہ اور مشاہدہ چاہے دوسری زبانوں کا ہو، اسے بہت اہمیت دی جاتی ہے اور یوسفی صاحب اردو

کے نثر نگار تو تھے ہی مگر پھر بھی انگریزی ادب اور شاعری ان کے مطالعے میں رہتے تھے ۔ تب یہ عقدہ مجھ پر کھلا کر تخلیق کے لئے یہ جاننا ضروری ہے کہ دوسری زبانوں میں ادیب اور شاعر اس عہد میں کیسا ادب تخلیق کر رہے ہیں ۔

یہ تھی یوسفی صاحب سے میری پہلی ملاقات ۔ بعد میں ملاقاتیں بڑھتی گئیں اور گھروں میں آنا جانا شروع ہو گیا ۔ یوسفی صاحب اگر کسی کے ہاں یا کسی تقریب میں شریک ہوتے جس میں میں بھی شامل ہوتا تھا تو یوسفی صاحب اپنے مشاہدے میں وہ چیزیں بھی لاتے جن کی مجھے خبر بھی نہ ہوتی ۔

یوسفی صاحب کا دھیما لہجہ ، پڑھنے کا مخصوص انداز اور اس انداز میں چھپی ہوئی حس مزاح ایک خاصی چیز تھی ۔ وہ گھنٹوں نہیں بولتے تھے مگر چند فقرے سب لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کرنے اور محفل کو زعفران زار کرنے کے لئے کافی ہوتے اوراس کے باوجود شاید ہی کبھی ان کے چہرے پر مسکراہٹ کے آثار پیدا ہوتے ۔

یوسفی صاحب کی شخصیت میں کوئی ایسی بات ضرور تھی جوان کو دیگر لوگوں سے ممتاز کرتی تھی ۔ وہ بات کیا تھی میں اس کا تجزیہ کرنے سے تو قاصر ہوں بس اتنا کہہ سکتا ہوں کہ یوسفی صاحب کی خاموش شخصیت سے محفل بھری بھری لگی تھی ۔

چنانچہ یوسفی صاحب کراچی چلے گئے تو ہم نے بھی کراچی جانا شروع کیا۔ وہ لندن آتے تو ہمارے یہاں قیام پذیر ہوتے ۔ میں کراچی جا تا تو ان کے در دولت پر حاضری دیتا۔ لوگ محفلیں منعقد کرتے ۔ یوسفی صاحب کو دعوت دی جاتی تو وہ ضرور تشریف لاتے ۔ایسی ہی بے شمارشا میں جو یوسفی صاحب کے ساتھ گزر میں میری زندگی کی یادوں کا سرمایہ ہیں ۔

ان کا ایک فقرہ جو وہ مجھے مخاطب کر کے بار ہا ارشادفرماتے کہ
صاحب آپ کے ہاں کی صحبتیں بہت یاد آتی ہیں۔

فیض صاحب کا انتقال ہوا۔1984ء کی بات ہے ۔ دور وز میں ہی ایک بھر پور ریفرنس جناب افتخار عارف صاحب نے اندن یو نیورسٹی میں ترتیب دیا۔ یوسفی صاحب نے وہاں تقریرفرمائی کسی کے انتقال پر ایسی تعزیتی تقریر میں نے آج تک نہیں سنی ۔ سامعین آزردہ بھی ہوئے۔ قہقہے بھی بلند ہوئے لیکن کوئی ایسی بات نہ ہوئی جس سے فیض صاحب کے خاندان والوں کو اعتراض ہوتا۔ اگر وہ لوگ بھی اس تقریب میں شریک ہوتے تو یوسفی صاحب کے وارے وارے جاتے ۔ معلوم نہیں یوسفی صاحب کی

وفات کے بعد کراچی میں کوئی تقریب ہوئی یا نہیں لیکن لندن میں صوفی Sofiکی تنظیم نے ایک تقریب یوسفی صاحب کے انتقال پر ملال پر ضرور کی جو ایک کامیاب تقریب تھی ۔اخبار میں خبر شائع ہوئی تو کسی نے لکھا کہ آہ یوسفی صاحب ۔ جناب رضاعلی عابدی نے فرمایا واہ یوسفی صاحب اور میری رائے میں ”سبحان اللہ یوسفی صاحب مناسب ہے کہ ایسی بھر پور زندگی گزارنے کے بعد زبان پہ سبحان اللہ ہی سجتا ہے۔

یوسفی صاحب نے چھ آٹھ دفعہ کراچی سے لندن تک کا سفر کیا۔ ان کی بیٹی رخسانہ ایک کامیاب میڈیکل کنسلٹنٹ ہیں۔ ان کے شوہر کا تعلق بھی طب کے شعبے سے تھا۔ شومئ قسمت سے ان کے شوہر کا انتقال ہو گیا۔ وہ بھی اپنے شوہر کے ساتھ ہمارے ہاں آ چکی ہیں ۔ان کے بڑے بیٹے راشد امریکہ میں ہیں ۔ وہ بھی کئی دفعہ تشریف لائے ۔انہوں نے ’زرگزشت‘ کا انگریزی ترجمہ بھی کیا۔ محاورہ بھی تر جما یہ گیا۔ یہ خوبصورت ترجمہ تھا۔ وہ چونکہ بینکر ہیں اس لئے انہوں نے ترجمے کے لئے ’زرگزشت‘ کا ہی انتخاب کیا۔ معلوم نہیں باقی کتابوں کے تراجم ممکن ہیں یانہیں؟ میری رائے میں تو ایسی خوبصورت تحریراردو ہی میں گھپ سکتی ہے۔

میں ایک دفعہ ہندوستان کی سیاحت پر نکلا ہوا تھا۔ اپنے دوست ایڈوکیٹ خلیل الرحمن کے ساتھ علی الصباح جے پور سے اجمیر کی طرف روانہ ہوئے ۔ ایک جگہ سے گزرے تو ٹین کے بورڈ پراردو میں اس بستی کا نام لکھا ہوا تھا ۔ چاکو ۔ خلیل نے فورا گاڑی رکوائی اور بتایا کہ یوسفی صاحب کی تحریروں میں چاکسوکلاں‘اور’ چاکسوخورڈ کے نام اکثر آئے ہیں ۔ چلیے یوسفی صاحب کو فون کرتے ہیں ۔ان کے اصرار پر میں نے فون کیا۔ کراچی میں اس وقت صبح کے 6 رہے تھے ۔ یونی صاحب کو معلوم نہ تھا کہ میں ہندوستان میں ہوں ۔ خادم نے ان کوفون پر بلایا۔ میری آواز سن کر گھبرا گئے ۔ بولے ۔لندن میں رات کا ایک بجا ہے ۔ خیر بیت تو ہے ۔ میں نے عرض کیا کہ میں اس وقت چاکسو میں ہوں اور آپ مجھے یاد آرہے تھے اس لئے میں نے آپ کو فون کیا ۔ ہمارے دوست خلیل جوزندگی میں یونی صاحب سے بھی نہیں ملے انہوں نے بھی یوسفی صاحب سے بات کی اور آج تک وہ محفل میں فخر سے اس بات کا تذکرہ کرتے ہیں کہ انہوں نے یوسفی صاحب سے گفتگو کی ۔ یوسفی صاحب نے بتایا کہ وہ اپنی ایڈمنسٹریٹو ملازمت کے دوران چاکسو‘ میں فائز رہے تھے۔ خلیل نے ان سے ادب اور نثر پر بھی کچھ مختصر گفتگو کی ۔ یوسفی صاحب کی طبیعت میں جیسے بشاشت آ گئی ۔

یوسفی صاحب اپنی تحریروں کی طرز اور ان کی معنویت کے بارے میں بہت محتاط تھے۔ فرمایا کرتے تھے کہ وہ جو کچھ لکھتے میں اسے وہ سال بھر کے لئے پال میں ڈال کر رکھ لیتے ہیں اور سال بھر بعد پھر کھنگالتے ہیں اور اگر پھر بھی وہ ان کے معیار پر پورا اترے تو اسے اپنی تحریروں میں شامل کر لیتے ہیں۔

یوسفی صاحب دبلے پتلے تھے ۔جسمانی لحاظ سے کمزور مگر ایک باہمت اور حوصلہ مند انسان تھے۔ بینکنگ کے شعبے میں اعلی ترین عہدوں پر فائز رہے۔ ایک دفعہ جنرل ضیاء الحق نے بینکاروں کی میٹنگ بلائی ۔ یوسفی صاحب بھی مدعو تھے۔ضیاءالحق نے سب بینکاروں کو تحکمانہ لہجے میں مخاطب کیا۔ سنا ہے جب یوسفی صاحب کی بطور صدر بینکنگ کونسل باری آئی تو انہوں نے ضیاء الحق صاحب کوسب لوگوں کی موجودگی میں کھری کھری سناد میں۔ ضیاءالحق ایسے جواب کے عادی نہیں تھے مگر یوسفی صاحب کے اس برملا جواب پر بالکل خاموش رہے ۔ شاید یہی وجہ یوسفی صاحب کے BCCI میں محترم آغا حسن عابدی سے تعلق کی بنیاد بنی۔

سندھ کلب کراچی یوسفی صاحب کی پسندیدہ جگہ تھی ۔ جب بھی کراچی جانا ہوتا تو لندن ہی سے انہوں نے دو پہر یا شام کا کھانا مشفق خواجہ صاحب کی معیت میں طے کر لیا ہوتا ۔ان ملاقاتوں میں یوسفی صاحب بالکل کھل کھیلتے ۔ میرے بھائی جان بھی ہمارے ساتھ ہوتے اور ہم چاروں بے حد بے تکلفی سے شائستگی کے ساتھ خوب گفتگو کرتے ۔ میرے لئے میدو پہر یا شام خداوند تعالی کا عطیہ ہوتی ۔ بچپن کی شرارتوں سے لے کر اولاد کے مسائل یعنی ہر بات پر گفتگو ہوتی ۔ سیاست اور مذاہب پر بھی بے لاگ تبصرے ہوتے ۔اس کے باوجود محسوس نہیں ہوتا تھا کہ موضوع بھاری ہو چکا ہے ۔ یوسفی صاحب شعروں میں ایک لفظ کی تبدیلی کرتے اور نہ صرف مصرعے کے معنی بدل دیتے بلکہ واقعی کشت زعفران بنادیتے

پیدا کہاں ہیں ایسے پراگندہ طبع لوگ
افسوس تم کو میر سے صحبت نہیں رہی

یونٹی صاحب کا ایک اقتباس عمل مزاح اپنے لہو کی آگ میں تپ کر نکھرنے کا نام ہے ۔ لکڑی جل کر کوئلہ بن جاتی ہے اور کوئلہ راکہ لیکن اگر کوگلے کے اندر کی آگ باہر کی آگ سے تیز ہوتو پھر وہ راکھ نہیں بنتا، ہیرا بن جاتا ہے ۔

یونٹی صاحب نے ایسے سیکڑوں ہیرے تراشے کہ وہ اردوادب میں ضرب المثل بن گئے ۔ ہم جب بھی مل بیٹھتے ہیں بذلہ نجی کی تفلیں بھی ہیں اور ان محفلوں میں یوسفی صاحب کے دہرائے ہوئے مصرعے:

تم میرے پاس ہوتی ہو گویا
جب کوئی دوسری نہیں ہوتی

بدل کر مریضوں کا ہم بھیس غالب
تماشائے اہل مطب دیکھتے ہیں

نبض پر ہاتھ دھرے منتظر فردا ہو
بیمار مباش کچھ کیا کر

فیضان علالت عام سہی، عرفان علالت عام نہیں
چھٹتی نہیں ہے منہ سے یہ کافی لگی ہوئی

اب تو گھبرا کے کہتے ہیں کہ گھر جائیں گے
گھر میں بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے

ایک ہم ہیں کہ ہوئے ایسے پشیمان کہ بس
ایک وہ ہیں کہ جنہیں چاۓ کے ارماں ہوں گے

محشر میں گئے شیخ تو اعمال نہ دارد
جس مال کے تاجر تھے وہی مال نہ دارد

سب کچھ اللہ نے دے رکھا ہے صحت کے سوا
علالت ہے عیادت جلوہ پیدا کر نہیں سکتی

:اور پھر دہرائے ہوئے جملے
"عذر گناہ لذیذ ازگناہ"
"اے مرد ناگہاں تجھے کیا انتظار ہے"
"صاف چھپتی بھی نہیں سامنے آتی بھی نہی"

20جون 2018ء کی دو پہر تھی اور میں اپنی بیوی حسینہ کے ساتھ Princess Royal یونیورسٹی اسپتال میں بطور مریض اپنی باری کا انتظار کر رہاتھا کہ ہمارے دوست فیضان عارف کا فون آیا کہ " یوسفی صاحب نہیں رہے دل دھک سے بیٹھ گیا۔ متوقع خبر تو تھی ہی مگر پھر بھی میرے اندر کوئی چیز ٹوٹ گئی ۔ صدمہ بھی تھا مگر دل تو سینے سے باہر نکلا جار ہا تھا۔ ایک عہد تمام ہو چکا تھا۔ حسینہ نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا اور کہنے لگیں کہ "اللہ مرحوم کے درجات بلند فرمائے ۔ بھر پور زندگی گزاری انہوں نے ۔ درست ہی کہا حسینہ نے ۔ واقعی بھر پور زندگی گزاری انہوں نے مگر پھر بھی اتنا بڑا خلا چھوڑ گئے ۔فرمان فتح پوری نے کہا تھا کہ ہم خوش نصیب ہیں کہ عہد یوسفی میں جی رہے ہیں اور مجھے خیال آ رہا تھا کہ اب ہم عہد یوسفی کے بعد کیا جئیں گے۔ ہمارا سرمایہ تو چھن گیا مگر جو انہوں نے علم وادب کا خزانہ چھوڑ اوہ ہمارا بحیثیت قوم اوران کے خاندن کا مشترکہ ورثہ ہے ۔

سوچ کے دل کہتا ہے کہ اب نہ تو وہ محفلیں ہوں گی اور نہ وہ محبتیں پھر بھی ان کا تخلیق کیا ہوا ادب میں سمجھتا ہوں کہ صدیوں تک پڑھا جائے گا ۔

ان کی کتا میں ادبی تاریخ میں ہمیشہ یاد رکھی جائیں گی ۔ یہ ہمارے زمانے اور یوسفی صاحب کے زمانے کے رہن سہن ، رسم ورواج اور زندگی گزارنے کے ڈھنگ پر ایک ایسا بے لاگ تبصرہ ہے کہ جس کی نظیر نہیں ملتی ۔ایسا اسلوب نہ ہم نے اس سے پہلے زندگی میں نہ پڑھا نہ سنا۔ یوسفی صاحب نے کروڑوں لوگوں کے دلوں کو شاد کیا۔ جواللہ کی مخلوق کو سرشاری وخوشی دیتا ہے اللہ کے ہاں اس کا بڑا درجہ ہوتا ہے۔اللہ نہیں جنت الفردوس کے اونچے درجات عطا فرمائے ۔

☆☆☆ ☆☆☆

ناصر کاظمی کا مثالی معاشرہ

باصر سلطان کاظمی MBE

ناصر جس معاشرے کا حصہ تھے اس کے مسائل، اس کی ترقی اور اس کی بدلتی ہوئی اقدار میں ان کی دلچسپی آخری سانس تک قائم رہی۔ میں ایک جگہ بیان کر چکا ہوں کہ اپنی زندگی کی آخری شام، طبیعت کی بے انتہا خرابی کے باوجود، وہ یہ جاننے کے لیے بے تاب تھے کہ صدر مملکت ذوالفقار علی بھٹو اس شام زرعی اصلاحات میں کن اقدامات کا اعلان کرنے والے تھے۔ اس سے چند روز قبل ٹی وی انٹرویو میں انہوں نے کہا تھا کہ "میرا خیال ہے جو غزلیں میں نے کہی ہیں، اپنی دانست میں یہ سوچ کر کہیں کہ وہ زمانے کے تقاضوں کو پورا کریں اور اس میں میرے عصر کی روح ہو۔

(1)

منیر احمد شیخ نے لکھا ہے: "ناصر کاظمی کی شاعری میں اس کا عہد سانس لیتا دکھائی دیتا ہے۔ ہجرت سے لے کر سیاسی تموج تک ہر سانحے اور واقعے کی لہریں اس کی شاعری میں موجود ہیں۔" نمونے کے طور پر ناصر کے متعدد اشعار نقل کرنے کے بعد وہ کہتے ہیں: "غرض کہ سینکڑوں اشعار اس مضمون کے ہیں، کن کن کا ذکر کیا جائے۔ سیاسی حالات کا مطالعہ وہ باطن کی آنکھ سے چپکے چپکے کرتا رہتا اور ان حالات سے پیدا ہونے والی فضا کا تاثر اپنے اشعار میں سموتا کہ اس کے اظہار کا میدان بھی یہی تھا۔

(2)

ناصر کا یہ جملہ کہ بانسری کو کس آئیڈیالوجی نے جنم دیا تھا بہت عرصہ موضوع گفتگو رہا۔ یہ سوال اہم ہے کہ کیا ناصر نے واقعی ادب میں آئیڈیالوجی کی مخالفت کی تھی اور اگر کی تھی تو اس کی نوعیت کیا تھی؟ مذکورہ بالا ٹی وی انٹرویو میں انہوں نے کہا تھا کہ سمجھ کر لکھا اور پاکستان کی پچیس سالہ تاریخ ان کے کلام میں دھڑکتی ہوئی نظر آئے Commitment انہوں نے جو لفظ لکھا گی۔ اسی انٹرویو میں انہوں نے کہا تھا کہ "شاعری صرف مصرعے لکھنے کا نام نہیں۔ شاعری تو ایک نقطہ نظر ہے زندگی کو دیکھنے کا، چیزوں کو دیکھنے کا، ان کو ایک خاص موزوں طریقے سے بیان کرنے کا۔

"

ناصر لکھتے ہیں کہ "شاعر کی شاعری اور اس کے نظریات کی ملاقات کسی مقام پر تو ہونی چاہیے۔ شاعر اپنے نظریات کو مسلسل تجربات، مشاہدات اور مطالعے کے بعد مرتب کرتا ہے اور شاعری میں انہیں ذائقہ بنا دیتا ہے۔ شاعر کا مطالعہ اور اس کے نظریات خام لوہے کی طرح ہوتے ہیں جو شعر میں دم شمشیر بن کر اپنے جوہر دکھاتا ہے۔

(3) انہوں نے شاعری کو اس لیے اپنایا کہ انہوں نے زندگی بسر کرنے کے کچھ اصول وضع کیے، ان اصولوں کو جسم دینے کے لیے یہی راستہ بہتر سمجھا۔ (4) تخلیق اور تعمیر کے لیے بغاوت، توڑ پھوڑ اور تخریبی قوتوں سے جنگ کا جذبہ ناصر کے مضامین، مکالموں اور شاعری میں جا بجا نظر آتا ہے۔ کبھی کبھی تو ایسے مقامات بھی آتے ہیں جب وہ زندگی کو سنوارنے کے لیے اپنے افکار کے اظہار کو کافی نہیں سمجھتے اور عملی طور پر کچھ کرنے کے لیے بے تاب نظر آتے ہیں

یہ بھی آرائش ہستی کا تقاضا تھا کہ ہم
حلقہ فکر سے میدان عمل میں آئے

برگ نے" میں ناصر "مصروف خدا" سے اپنی دنیا کو دیکھنے کا مطالبہ کرتے ہیں جس میں اتنی خلقت کے ہوتے ہوئے بھی شہروں میں سناٹا ہے اور جھونپڑی والوں کی تقدیر بجھا بجھا سا ایک دیا ہے۔ "دیوان" میں وہ لوگوں سے کہتے ہیں کہ اگر بدل سکو تو باغبان کو بدل دو ورنہ یہ باغ سایہ سرو سمن کو ترسے گا۔ وہ دل کی بات سنانے کے لیے سر مقتل بھی صدا دیتے ہیں۔ چنانچہ نتیجہ تو یہی بھی تھی۔ جہاں تک "آئیڈیالوجی اور Commitment نکلتا ہے کہ ناصر کے کچھ اصول اور نظریات تھے جن کے ساتھ ان کی بانسری" والے فقرے یا اس طرح کی کسی اور بات کا تعلق ہے تو میرے خیال میں اس کا پس منظر یہ تھا کہ آئیڈیالوجی کا لفظ بالعموم سیاسی اور معاشی، بالخصوص مارکسی نظریات کے حوالے سے سمجھا اور استعمال کیا جاتا تھا/ ہے۔ ڈکشنریوں کے مطابق آئیڈیالوجی سے مراد کسی گروہ، طبقے یا فرد سے وابستہ خیالات و عقائد کا نظام یا انداز فکر بھی ہے۔1969 میں حلقہ ارباب ذوق کے خطبہ صدارت (5) میں ناصر نے حلقے اور ترقی پسند تحریک کے بارے میں جن خیالات کا اظہار کیا ان سے ان کے آئیڈیالوجی سے متعلق نقطہ نظر کو سمجھنے میں بہت مدد ملتی ہے۔ ناصر ادب کا دائرہ کار محدود کرنے کے حق میں نہیں تھے۔ ان کے نزدیک اگر ادب کو کسی ضابطے کا پابند کر دیا جائے تو تخلیق اور ایجاد کے امکانات کم اور بعض اوقات بالکل ختم ہو جاتے ہیں۔ انہوں نے ایک جگہ کہا تھا کہ وہ فطرت کے نمائندے ہیں اور جو کچھ دیکھتے، سنتے اور محسوس کرتے ہیں ماضی، حال اور مستقبل کی قید سے باہر نکل کر بیان کرتے ہیں۔ (6) انہوں نے یہ بھی کہا تھا کہ "شاعر جو ہے وہ ساری انسانیت کے بارے میں سوچتا ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ جب اوروں کا بھلا ہو گا تو اس کا اپنا بھلا خود بخود ہو گا۔" "دیوان" میں
ایک شعر بھی اس مضمون کا ہے

ہے یہی عین وفا دل نہ کسی کا دکھا
اپنے بھلے کے لیے سب کا بھلا چاہیے

اور یہی ناصر کے آئیڈیل معاشرے کا بنیادی تصور ہے۔ ایک ایسا معاشرہ جس میں لوگ دوسروں کے ساتھ زیادہ سے زیادہ بھلائی کرنے کی کوشش کرتے ہیں، محض کار ثواب کے طور پر نہیں بلکہ اس ادراک کے نتیجے میں کہ لوگوں کا بھلا ہونے سے معاشرہ بہتر ہو جاتا ہے جس کا فیض اس فرد کو بھی پہنچتا ہے جس نے دوسروں کا بے غرض بھلا کیا ہوتا ہے۔ معاشرہ پانی کے کنویں کی طرح ہوتا ہے جس کو صاف اور محفوظ رکھنا ہر فرد کی ذمہ داری ہے کیونکہ وہ خود بھی اس سے پانی حاصل کرتا ہے۔ اس کے برعکس برائی کرنے والوں کو یہ شعور نہیں ہوتا کہ ان کے برے کاموں کا شکار بالآخر خود انہیں اور ان کے خاندان کو بھی ہونا پڑے گا۔ ہمیں ناصر کے آئیڈیل معاشرے کی ایک اہم خصوصیت ان کے مذکورہ بالا ٹی وی انٹرویو میں بھی ملتی ہے جہاں وہ اس چھوٹے سے شہر کو یاد کرتے ہیں جس میں وہ ہجرت سے پہلے رہتے تھے۔ وہاں "سب لوگ، امیر، غریب بڑے سکھ اور امن سے رہتے تھے اور جو بظاہر غریب ننھے منے لوگ تھے، ان کی عزت بھی اتنی ہی تھی جتنی کہ بڑے لوگوں کی بلکہ شاید ان سے بھی زیادہ۔

ناصر کے مذکورہ بالا خطبہ صدارت میں عزم اور امید کی وہ جھلک نظر نہیں آتی جو ان کے کلام اور گفتگو میں، پچاس کی دہائی میں دکھائی دیتی تھی۔ اس کے برعکس ان کا لہجہ تلخ ہے اور وہ عام لوگوں کے ساتھ ہونے والی نا انصافی کے بتدریج بڑھتے ہوئے رجحان اور اس کے نتیجے میں وسائل کے چند ہاتھوں میں مرتکز ہو جانے کے خلاف احتجاج کرتے نظر آتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ قیام پاکستان کے وقت ایک بے سروسامانی کا عالم تھا لیکن اس وقت اصل چیز ساز و سامان نہیں تھی بلکہ آزاد ہو جانے کا احساس تھا۔ اس احساس سے کچھ خواب وابستہ تھے جو قوم کی آنکھوں میں بھی تھے اور ادیب کی آنکھوں میں بھی۔ مگر زمانہ بدلتا گیا۔ بہت سوں نے اپنے خوابوں کی تعبیر الاٹمنٹوں میں، اونچے عہدوں میں دیکھ لی۔ پھر وقت گزرنے کے ساتھ خوابوں کا یہ چشمہ خشک ہوتا گیا۔ ناصر شکوہ کناں ہیں کہ "اوپر والے" چند لوگ ملک سے متعلق کسی بھی فیصلے میں عام لوگوں کو شریک نہیں کرتے۔ اہل وسائل نے وسائل اپنے قبضے میں کر لیے اور مسائل ہمارے کھاتے میں ڈال دیے۔ چنانچہ معاشرے میں "مسائل اور وسائل کی جنگ" چھڑ چکی ہے۔

دیوان' کی غزلوں میں یہ تلخی نمایاں طور پر محسوس کی جا سکتی ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ اس معاشرے کا تصور بھی واضح ہوتا' گیا ہے جسے وہ اپنے خوابوں کی جنت کہتے ہیں۔ ناصر کے اشعار، مضامین اور مکالمے دیکھ کر دھیان سوشلسٹ، کمیونسٹ اور مغرب کی جمہوری فلاحی ریاستوں کی طرف جاتا ہے لیکن اقبال کی طرح ناصر کے لیے بھی تحریک کا سب سے بڑا منبع قرآن حکیم تھا۔ وہ اپنی ڈائری میں لکھتے ہیں کہ جس نے قرآن نہیں پڑھا، وہ حکمت، عبرت، حیرت کی منازل سے محروم رہا اور وہ ہرگز ہرگز اچھا شاعر نہیں ہو سکتا۔ (7) ان کے آخری انٹرویو میں جب ان سے کوئی غزل سنانے کی فرمائش کی گئی تو انہوں نے اپنی کسی مقبول عام یا تازہ غزل کی بجائے "غور سے سن" ردیف والی غزل کا انتخاب کیا اور کہا کہ "یہ غزل، اس میں تھوڑی سی خطابت ہے مگر

یہ ہے کہ بعض وجوہ سے مجھے پسند ہے کہ طلوع و غروب کے مناظر ہیں، حیرت و عبرت کہ دنیا میں کیا ہوتا ہے، کس طرح چیزیں ڈوبتی ابھرتی ہیں، کس طرح صبح شامیں ہوتی ہیں اور کچھ قرآن کریم پڑھنے والوں کے لیے۔" (8) ایک اور جگہ ناصر نے لکھا ہے کہ وہ قرآن کو ادب سمجھ کر پڑھتے تھے۔ (9) اپنی نظم "اے ارض وطن" میں ناصر پاکستان کو اپنے اور اپنے آبا کے خوابوں کی ایسی جنت کے طور پر دیکھتے ہیں جو ان کی کشتی کا ساحل، ان کی کھیتی کا حاصل، مزدوروں کی محنت، مجبوروں کی طاقت، گیتوں کا سندر بن، ماہی گیروں کی جنت، جزیروں کی ٹھنڈی رات، اندھیری راتوں کا چاند، برساتوں کا جگنو، غربت کا سرمایہ اور ہمت کا پرچم ہو۔

برگ نے" اور "دیوان" کا مطالعہ ہمیں بتاتا ہے کہ ناصر کا آئیڈیل معاشرہ وہ ہے جہاں عدل ہو اور ہوائے ظلم کا گزر نہ ہو، جہاں راستے سنسان اور بے چراغ نہ ہوں، لوگ رات کو بھی گھروں میں اور گھر سے باہر اپنے آپ کو محفوظ سمجھیں، گھروں کی دیواروں سے اداسی نہ ٹپکتی ہو، جھونپڑی والوں کی تقدیر بجھا بجھا سا دیا نہ ہو بلکہ کوئی اتنا غریب نہ ہو کہ اس کے خواب کڑوے ہوں، چند گھرانوں نے مل جل کر اکثریت کا حق نہ چھینا ہو، باہر کی مٹی کے بدلے گھر کا سونا نہ بیچا جاتا ہو، میر کارواں کارواں سے دور نہ ہو، نکہت اہل ہنر رائیگاں نہ جاتی ہو، شہر سہمے ہوئے ہونے کی بجائے چہکتے بولتے ہوں، جاہلوں کی بجائے اہل علم کی کھیتی پھلتی پھولتی ہو، جنہیں سلیقہ شعور ہو انہیں بے زری نہ بچھا دے اور جو سینہ ہ خاک پر گراں ہوں وہ معتبر نہ بن بیٹھیں، محلات شاہی نہ ہوں، ناز کجکلاہی مٹ چکا ہو، خاک نشیں سر اٹھا کے چلتے ہوں، حسن انتظام ہو، انصاف کا دن اور اہل وفا کا دور ہو۔ اس معاشرے کے مثالی افراد روشنی دکھانے، دوستی نبھانے، عمارتیں بنانے اور زمین کا بوجھ اٹھانے والے ہوں۔

☆☆☆ ☆☆☆

حوالہ جات

1 ناصر کاظمی (1976ء) "ٹی وی انٹرویو"، مشمولہ ہجر کی رات کا ستارہ۔ مرتبہ احمد مشتاق۔ نیا ادارہ، لاہور
2 منیر احمد شیخ (1976ء) "چراغوں کا دھواں"، مشمولہ ہجر کی رات کا ستارہ۔
3 ناصر کاظمی (1982ء) "شہری فرہاد" مشمولہ خشک چشمے کے کنارے، مکتبۂ خیال، لاہور۔
4 ناصر کاظمی (1982ء) "میں کیوں لکھتا ہوں" مشمولہ خشک چشمے کے کنارے۔
5 ناصر کاظمی (1982ء) "خطبہ صدارت، حلقہ ارباب ذوق"، مشمولہ خشک چشمے کے کنارے۔
6 ناصر کاظمی (1995ء) "ناصر کاظمی کی ڈائری"، مکتبۂ خیال، لاہور، صفحہ 65۔
7 ناصر کاظمی (1995ء) "ناصر کاظمی کی ڈائری" صفحہ 125۔
8 ناصر کاظمی (1976ء) "ٹی وی انٹرویو" مشمولہ ہجر کی رات کا ستارہ۔
9 ناصر کاظمی (1990ء) "میرا ہم عصر"، مشمولہ خشک چشمے کے کنارے

ٹیپو سلطان کے 5 خواب
از فتح علی ٹیپو، سلطان میسور
تحریر ڈاکٹر اکمل مخدوم

چند سال پہلے کچھ تحقیق کے بعد، بر صغیر پاک و ہند کے بہادر سپوت، شہید عظیم سپہ سالار و حکمران، فتح علی ٹیو المعروف ٹیپو سلطان کی لکھی فارسی ڈائری کے چند اوراق ہے، جو وہ مکمل رازداری میں رکھتے تھے اور یہ مسودہ ان کے بستر کے ایک خفیہ خانے سے ملا تھا، جس کو برطانیہ کے اندرون خانوں میں بھلا دیا گیا تھا۔ اور پھر مزید کوشش پر ان کی اس تصنیف کا انگریزی ترجمہ معروف عالم و محق ڈاکٹر محمود حسین کا کیا ہوا ملا، اور اس مسودہ کا اردو تر جمعہ ناچیز نے کیا ہے، بہ عنوان: ٹیپو سلطان کے خواب یہ کتاب حوالہ ناشر ہے۔

،اس مسودہ سے ماخوذ پانچ پہلے خواب پیش ہیں، جو اس عظیم شخص نے اپنے قلم سے لکھے۔ اس میں تواریخ نامانوس لگیں گی وہ اس لیے کہ ٹیپو سلطان نے دن، ہفتے، مہینے اور سالوں کو منفرد طریق سے مرتب کیا تھا۔ یہ ایک علیحدہ اور نہایت دلچسپ باب ہے کتاب میں۔

پہلا خواب
مرہٹہ فوج کے تین افسر

قمری مہینے احمدی کی پہلی تاریخ کو، جمعرات کی رات، سال دلو کے شروع میں، بارہ سو ہجری میں جب تین حصے پانچ گھڑیاں کی گزر چکی تھیں، شمس آباد میں پڑاؤ کے وقت مجھے ایک خواب آیا: میں نے دیکھا کہ جیسے مرہٹہ فوج آگئی ہے اور میں نے ان کے سپہ سالار کو مقابلے کے لئے للکارا ہے کہ اکیلا مقابلہ کرے۔ مرہٹہ فوج کا ایک مسلمان افسر میری اس للکار کو قبول کرتا ہے، میدان جنگ میں جب دونوں افواج ایک دوسرے کے سامنے کھڑی ہیں ۔ میں ایک ہی وار سے مرہٹہ فوج کے مسلمان افسر کو ختم کر دیتا ہوں۔ یہ دیکھتے ہیں مرہٹہ فوج کا سپہ سالار جو کہ نوجوان ہے ، فرار اختیار کرتا۔ میں اس کا پیچھا کرتا ہوں اور ایک وار سے اس کا خاتمہ کر دیتا ہوں۔ میں تیسرے افسر کا خاتمہ بھی کرتا ہوں جو ایک اہم رتبے پر ہے۔ ان تینوں کو ایک ایک وار سے ہلاک کرنے کے بعد، میں واپس اپنی فوج کے پاس آتا ہوں، فاتح اور کامیاب۔ پھر خواب میں یہ دیکھتا ہوں کے

میرے تمام افسر اور حیدر صاحب (یہ ٹیپو سلطان کے والد کے دوست تھے جنہوں نے ٹیپو سلطان کے والد حیدر علی کو میسور کے راجہ سے متعارف کیا تھا) گھر کے اندر کھانا کھا رہے ہیں۔ میں تھکا ہوا ان سے پانی مانگتا ہوں۔ موجود لوگ مبارک دینے کے بعد مجھ سے یہ درخواست کرتے ہیں کہ میں کھانا کھانے کے بعد پانی پیوں۔ اسی اثنا میں ایک سفید داڑھی والے معزز بزرگ ہاتھوں میں بالائی اور مٹھائیاں پیش کرتے ہیں، اور مجھے کو دیتے ہیں، میں ان سے یہ مٹھائی اور بالائی لے کر کھاتا ہوں، اور خود سے کہتا ہوں کے پہلے کبھی اس طرح کی مزے دار اور پر لطف مٹھائی نہیں کھائی، بہت ہی اعلی ذائقہ دار ہے۔ اس کے بعد میں وضو کرتا ہوں، اور اپنے افسران سے پوچھتا ہوں کہ کیا انہوں نے کفار کی فوج کو تباہ کر دیا ہے۔

حیدری افواج کے افسران جواب دیتے ہیں کہ انہوں نے اس معاملے میں کوئی پیش رفت نہیں کی، اور دشمن کی فوج کو تباہ نہیں کیا بلکہ وہ حکم کے منتظر تھے۔ وہ یہ کہتے ہیں کہ اس دوران کفار کی فوج اپنے خزانے سمیت مقامی کاؤوں میں موجود ہے۔ فوج کو تیار کرنے کے بعد میں فوری دشمن کی جائے پناہ کی طرف پیش قدمی کرتا ہوں اور اپنے معاون سے تلوار لے کر اپنی کمر پر باندھ لیتا ہوں، اور میں سید جنید اور سید غفار اور دوسرے افسران کو بھی اپنے سپاہیوں کو جنگ کے لیے تیار رہنے کا کہتا ہوں۔ بس یہی ہے۔

(یہاں پر مترجم کے لکھتے ہیں کہ سید جنید ٹیپو سلطان کے وفادار فوجی افسر تھے، سید غفار پہلے ارکوٹ کے نواب کی فوج میں تھے اور ٹیپو سلطان کے انتہائی با اعتماد تھے، بہت بہادر اور وفادار انسان اور ان کی فوج کے افسر تھے سنہ سترہ سو بیاسی سے۔ وہ سرنگا پٹنم کی آخری لڑائی جو انگریزوں کے خلاف لڑی گی، اس میں شہید ہوئے ۔ وہی جنگ جس میں ٹیپو سلطان خود شہید ہوے)

چوتھا خواب
دودھ کے گلاس
یا اللہ رحیم

حضرت محمد کی پیدائش کے بارہ سو اٹھارویں سال، تقی کے مہینے کی بدھ کی رات کو، جب چار گھڑیاں ابھی باقی تھیں، جب ہم سلام آباد قرب مدھر گیراہ میں راما نیر کی فوجی چھاؤنیوں کو فتح کر کے واپس آرہے تھے مجھے ایک خواب آیا۔ ایسا لگا کے ایک شخص کانے کا دودھ دوھنے کے فورا بعد تازہ دودھ سے بھرے دو جگ میرے پاس لے کے آیا ہے۔ اور مجھے کہتا ہے کہ تازہ

دودھ سیدھا گانے کے تھنوں سے میرے پاس لایا ہے اور یہ بہت میٹھا ہے ، مزے دار ہے، اور مکھن سے بھرا ہوا ہے۔ میں اس کے ہاتھ سے جگ لے لیتا ہوں اور دیکھتا ہوں کہ اس تازہ دودھ میں مکھن کے ٹکڑے ابل کر اوپر آگر پھیل رہے ہیں۔ اس شخص کو یہ بتانے کے بعد کہ دودھ بہت میٹھا اور بہت ذائقے دار ہو گا، میں یہ دودھ لیکر اپنے پاس رکھ دیتا ہوں، اور اسی لکھے میری آنکھ کھل جاتی ہے، اور میں یہ خواب لکھ لیتا ہوں۔

پانچواں خواب
سمندری ناریل
یا اللہ الحق

زبرجدی نے کی اکیس تاریخ کی رات، کہ نیا دن منگل ہے، جو کہ ذیقعد کی انیسویں رات بنتی ہے، جبکہ صبح سورج طلوع ہونے والا ہی تھا، پین دارالخلافہ میں مجھے مندرجہ ذیل خواب آیا۔ ایسا لگا کہ میں ایک اوپر کی بڑی منزل کے کمرے میں گیا ہوں، جہاں پر مجھے چالیس سے پچاس سمندری ناریل نظر آتے ہیں۔ سب سے چھوٹا ناریل ایک لیموں جتنا تھا اور سب سے بڑا ایک چھوٹے مٹکے جتنا۔ میں ان سب کو اکٹھا کر کے اپنے سامنے رکھ لیتا ہوں۔ میں ناریل کے پانی بھی تعریف کرتا ہوں اور کہتا ہوں کہ یہ نہایت میٹھا اور مفرح ہے۔ میں نے دو یا تین مرتبہ پہلے سمندری ناریل کا پانی چکھا ہوا ہے مگر مجھے وہ کھارا لگا تھا۔ مجھے حیرانی ہوئی کہ ان ناریلوں کا پانی اتنا میٹھا ہے ۔ اتنی دیر میں کچھ عورتیں جو اجنبی تھیں اور وہیں بیٹھی ہوئی تھیں، ایک بڑے ناریل کا خول توڑ کر مجھے ناریل کی گری دیتی ہیں، یہ کہتے ہوئے کہ یہ بہت میٹھی ہے۔ میں اسکو اپنے ہاتھ میں پکڑتا ہوں، باقی ناریل سب میرے سامنے پڑے ہوئے تھے۔ تب میری آنکھ کھل گئی اور پھر میں دوبارہ سو نہیں سکا۔

خودکشی، ذہنی امراض اور دفعہ 335 میں ترمیم؛ چند گزارشات

(ڈاکٹر افتخار احمد، برطانیہ)

دسمبر کے آخری ہفتہ میں سینٹ میں مجموعہ تعزیرات پاکستان 1860 اور مجموعہ ضابطہ فوجداری 1898 میں ترامیم کے بل پیش کیے گئے اور کچھ تو منظور کر لیے گئے اور ایک ترمیم، جو خودکشی کو ذہنی بیماری قرار دینے سے متعلق تھی، اس کو اسلامی نظریاتی کونسل کی رائے کے لیے بھیج دیا گیا۔ پریس میں اس پر کوئی زیادہ بحث نظر نہیں آئی اور سینٹ میں ہونے والی بحث بھی ہماری سوسائٹی میں مروجہ رویوں کی ہی عکاسی کر رہی تھی جو بذات خود کوئی انہونی بات نہیں۔

جہاں چند سینٹرز نے خودکشی جیسے اقدام کے پس منظر میں ذہنی بیماری اور دوسرے ممالک میں ہونے والی قانون سازی پر توجہ دلائی وہیں مذہب میں اس پر سخت قدغن کو اجاگر کیا گیا اور اس خدشے کا اظہار کیا گیا کہ کہیں اس ترمیم کے ذریعے ختم ہونے والی سزا کے نتیجے میں خودکشی جیسے اقدام کو شہ تو نہ ملے گی۔ آج کا یہ بلاگ قانون سازی کے عمل بارے تو نہیں کہ جس کا کام اس کو ساجے، ہاں خودکشی اور اس کی وجوہات بارے ہمارے ہاں پائے جانے والے رویوں اور اس انسانی اذیت اور اس کے علاج بارے جدید طبی علم کی روشنی میں چند گزارشات ہیں، کہ شاید کہ تیرے دل میں اتر جائے میری بات۔

عالمی ادارہ صحت (ڈبلیو ایچ او) کے اندازوں کے مطابق ہر سال دنیا میں تقریباً سات لاکھ افراد خودکشی کر لیتے ہیں یوں عالمی سطح پر خودکشی کی شرح ہر ایک لاکھ کی آبادی میں 11.4 بنتی ہے۔ کیونکہ یہ ایک بہت حساس موضوع ہے اور مختلف ممالک کے کلچر، قوانین اور مذہبی عقائد کی بنا پر یہ بات بھی یقینی ہے کہ بہت سی اموات رپورٹ ہی نہیں ہوتیں اور ڈیتھ سرٹیفکیٹ پر حادثہ یا کوئی اور وجہ تحریر کر دی جاتی ہے۔ علاوہ ازیں بہت سے ممالک میں میں تو نظام کی کمزوری کی بنا پر وجہ موت رجسٹر ہی نہیں ہوتی۔

امیر، ترقی یافتہ ممالک میں مردوں میں عورتوں کی نسبت خودکشی کی شرح تین گنا زیادہ ہے جبکہ غریب اور متوسط آمدنی والے ممالک میں یہ نسبت کی یہ شرح کم ہو کر 1.5 گنا رہ جاتی ہے۔ عالمی اعداد و شمار کے مطابق پرتشدد وجہ اموات میں خودکشی کرنے والوں کا حصہ مردوں میں پچاس فیصد اور خواتین میں اکہتر فیصد ہے، جی ہاں آپ نے صحیح پڑھا، خواتین میں با تناسب پرتشدد موت کی شرح زیادہ ہے۔ اسی طرح خودکشی کی شرح عمر کے مختلف حصوں میں بھی مختلف ہو سکتی ہے۔مثلاً دنیا کے تمام حصوں میں عموماً اس کی شرح ستر سال سے زیادہ عمر کے مردوں اور عورتوں میں سب سے زیادہ ہے، اس طرح یہ شرح مختلف

ممالک میں عمر کے مختلف حصوں میں مختلف ہو سکتی ہے۔ ایک اور بات جو یاد رکھنے کے لائق ہے کہ عالمی ادارہ صحت کے اندازے کے مطابق خودکشی سے ہونے والی ہر ایک موت کے پس منظر میں دس سے بیس کے درمیان خودکشی کی ایسی کوششیں ہیں جو انجام تک نہیں پہنچتیں۔ دنیا میں خودکشی سے ہلاک ہونے والے افراد میں سے تقریباً 77 فیصد کا تعلق غریب ممالک سے ہوتا ہے۔

خودکشی کے لیے کیڑے مار یا زرعی ادویات، اپنے آپ کو پھندا لگانا اور آتشیں اسلحہ کا استعمال عالمی سطح پر تقریباً ہر جگہ عام ہے، اگرچہ مختلف علاقوں میں مقامی سطح پر آسانی سے دستیاب وسائل اس سلسلے میں اہم ہوتے ہیں اور اس کے بارے میں مکمل معلومات، خودکشی کی روک تھام میں پالیسی سازوں کے لیے اہم ہوتی ہیں۔ اس پس منظر میں اگر وطن عزیز میں خودکشی جیسے عنصر کا مطالعہ کریں تو چند حقائق نظر آئیں گے۔

عالمی ادارہ صحت کے اندازے کی مطابق سنہ 2019 میں پاکستان میں تقریباً 19 ہزار افراد نے خود اپنی زندگی کا خاتمہ کر لیا۔ اس طرح اس کی شرح ہر ایک لاکھ کی آبادی میں 8.11 بنتی ہے لیکن ہمیں اس حقیقت کو بھی مد نظر رکھنا ہو گا کہ ہمارے ہاں سرکاری سطح پر اس سلسلے میں کوئی اعداد و شمار نہیں جمع کیے جاتے۔ جو چند تحقیقی رپورٹس اب تک شائع ہوئی ہیں ان کے مطابق پچھلے 50۔ 60 سال میں اس کی شرح میں اضافے کا رجحان ہے جو کہ عالمی سطح پر تبدیلیوں کی عکاسی کرتا ہے۔
ہمارے ہاں خودکشی کی شرح تیس سال سے کم عمر بالخصوص خواتین اور ان میں بھی شادی شدہ خواتین میں نسبتاً زیادہ ہے۔ شادی شدہ خواتین میں یہ اضافی شرح، مغربی ممالک میں شادی شدہ خواتین کے مقابلے میں واضح طور پر زیادہ ہے جہاں شادی کو اس سلسلے میں ایک حفاظتی عمل تصور کیا جاتا ہے۔ اس طرح لگتا ہے کہ پاکستانی خواتین میں ازدواجی مسائل اور خاندانی نظام ایک واضح دباؤ کی حیثیت رکھتا ہے۔

اگر آپ ڈاکٹروں یا دوسرے ماہرین سے اس سلسلے میں بات کریں تو وہ خودکشی کرنے یا ایسی کوشش کو جرم گردانتے والے موجودہ قانون کو اس عمل اور ذہنی صحت بارے واضح تصویر کی راہ میں بطور رکاوٹ ہونے کے نشاندہی کریں گے۔ مجموعہ تعزیرات کے مطابق خودکشی کی کوشش کرنے والا قید یا جرمانے یا دونوں کا سزا وار ہو گا اور قید کا عرصہ ایک سال (PPC 325) پاکستان تک ہو سکتا ہے۔ کیا آپ کو معلوم ہے کہ یہ قانون برصغیر میں برطانوی راج میں 1861 میں نافذ کیا گیا تھا اور جبکہ خود برطانیہ میں سنہ 1961 میں یہ قانون تبدیل ہو چکا ہے اور سوسائٹی میں بھی اس بارے تنقیدی رویوں میں تبدیلی آ چکی ہے اور اس بارے میں مسلسل تحقیق سے ایسی پالیسیز بن رہی ہیں جو زیادہ انسان دوست ہیں اور لوگوں کے لیے مدد حاصل کرنا آسان ہو گیا ہے۔

لیکن ہم ہیں کہ دوسرے قوانین کی طرح اس کو بھی اپنے ماضی کی یاد کے طور پر اپنے سینے سے لگائے بیٹھے ہیں۔ دنیا کے اکثریتی ممالک میں اس سلسلے میں قوانین بدل چکے ہیں لیکن بیس ممالک ایسے ہیں جن میں یہ قدم ابھی بھی جرم تصور کیا جاتا ہے۔
سنہ 2017 میں اسلامی نظریاتی کونسل کی کی سپورٹ کے بعد سینٹ نے یہ بل منظور کر لیا لیکن قومی اسمبلی سے پاس نہ ہونے کی بنا پر پچھلی حکومت کی مدت پوری ہونے پر غیر موثر ہو گیا۔ یہ بات یاد رہے کہ پاکستان نے بطور ایک ذمہ دار ریاست کے، عالمی ادارہ صحت کے (Mental health Actin Plan 20132030 ۔) پر دستخط بھی کیے ہوئے ہیں جس کے مطابق اس عرصے میں خودکشی کی روک تھام اور اس کی شرح میں دس فیصد کمی لانا تھا۔

وطن عزیز میں 97 فیصد آبادی مسلمانوں کی ہے جبکہ باقی 3 فیصد بھی مذہبی اقلیتیں ہیں۔ ہماری مذہبی، سماجی اقدار اور ان میں موجود خودکشی بارے حساسیت کی وجہ سے اس موضوع پر بہت زیادہ تحقیق بھی نہیں ہوئی۔

خودکشی ایک پیچیدہ رجحان یا عمل ہے جس میں بہت سے عوامل کام کر رہے ہوتے ہیں، مثلاً ذہنی بیماری کی موجودگی، تکلیف دہ واقعات زندگی، انفرادی شخصی خصوصیات، سماجی دباؤ، خاندان میں پہلے سے کسی فرد کی خودکشی کا واقع وغیرہ وغیرہ شامل ہیں۔

کی شرح پاکستان میں کافی زیادہ پائی گئی ہے لیکن اس اور دوسرے ذہنی امراض (Depression) ذہنی امراض بالخصوص ڈپریشن کی تشخیص اور علاج بہت ہی کم ہے۔ اسی طرح مسلسل سیاسی بے یقینی، کمزور ہوتی معاشی صورت حال اور عمومی طور پر حکومتی اداروں پر بے اعتمادی کی فضا ایک خوف اور بے چینی کی کیفیت کو جنم دیتی ہے جو کہ ذہنی صحت کے لیے اچھا نہیں۔ یہ مسائل سوسائٹی میں ذہنی صحت کے لیے روایتی طور پر موجود مضبوط حفاظتی عوامل مثلاً مذہب اور خاندانی نظام کے اثرات وغیرہ کو کمزور کر دیتے ہیں اور ڈپریشن اور دوسرے ذہنی دباؤ کی شرح میں اضافہ کا باعث بنتے ہیں جو خودکشی کے رجحانات کو ہوا دیتے ہیں۔
اس لیے حالیہ سالوں تحقیق سے میں جہاں غربت اور بگڑتے معاشی عوامل کا خودکشی کے رجحانات پر منفی اثرات کا ادراک ہوا ہے وہیں ذہنی امراض بالخصوص ڈپریشن اور ذہین امراض بارے سماجی رویوں کے خودکشی جسے عمل پر اثرات ایک اہم امر ہے۔

خودکشی ایک انسانی المیہ ہے اور اس کوشش کی کامیابی کی صورت میں میں متاثرہ فرد تو بظاہر دکھوں سے نجات پاتا نظر آتا ہے لیکن اس کے متعلقہ گھر کے افراد، اس کی فیملی اور دوستوں عزیزوں اور جاننے والوں کی ایک طویل فہرست ہے، ایک نہ ختم ہونے والے عذاب کا سامنا کر گے ہیں۔ جہاں انہیں ایک طرف اپنے عزیز کے جانے کے غم کا سامنا ہوتا ہے تو دوسری طرف سماجی سطح پر خودکشی بارے عمومی رویوں کا اور لوگوں کی چبھتی نظروں اور تیکھے سوالوں کا جواب ڈھونڈنا پڑتا ہے اور اپنے خاندان

کی نیک نامی اور بچوں کے مستقبل کی فکر رات کی نیند اڑا دیتی ہے۔

ایسی صورت حال میں اگر قانون نافذ کرنے والے ادارے بھی قانونی چارہ جوئی کے لیے پہنچ جائیں تو ہمارے معاشرے میں اس خاندان کی ذہنی اور نفسیاتی حالت سمجھنے کے لیے آپ کو کسی پی ایچ ڈی کی ڈگری کی ضرورت نہیں۔ ویسے آپس کی بات ہے کہ ہمارے ہاں قانون کے نفاذ کی تیزی دیکھنی ہو تو اس کے لیے صرف آپ کا غریب ہونا ہی کافی ہے۔ اور اگر خودکشی کی کوشش ناکام ہو جائے (جو کہ طبعی نقطہ نظر سے ماہرین کو موقع فراہم کرتی ہے کہ وہ متاثرہ فرد کی تکلیف کو سمجھ کر دور کرنے کی کوشش کریں) ، تو اوپر بیان کردہ نقشے میں اس متاثرہ فرد کا اضافہ اور خاندان کی تکالیف کا بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

پاکستان میں ہمارے پاس کوئی ایسے اعداد و شمار موجود نہیں ہیں جو بتا سکیں کہ کتنے افراد پر آج تک دفعہ 335 کے تحت مقدمہ درج کر کے عدالتی کارروائی کی گئی ہے لیکن مشاہدہ یہ ہے کہ یہ بہت بڑے تعداد نہیں ہو گی۔ مشاہدہ یہ بھی بتاتا ہے کہ ضخیم قانونی دفعات میں یہ ایک چھوٹی سی دفعہ پولیس اور ہسپتال کے عملے کو اس قابل بنا دیتی ہے کہ وہ متاثرہ فرد اور اہل خانہ سے کچھ نہ کچھ بٹور سکیں۔

"اس قانون کے تحت خودکشی کے عمل کو "مجرمانہ اقدام" (criminalisation) قرار دینے کے حق میں تین دلائل دیے جاتے ہیں۔

پہلا یہ کہ سزا کا خوف بذات خود ایک عبرت (deterrent) ہے لیکن تمام تر تحقیق ظاہر کرتی ہے کہ جن ممالک میں سزا کا قانون ختم کر دیا گیا وہاں عموماً خودکشی کی شرح کم ہو گئی۔

دوسرے یہ کہ خودکشی کے لیے مجرمانہ سزاؤں کے قوانین دراصل اس سوسائٹی کی۔ ایسے اقدامات کے خلاف، اخلاقی مذمت کا اظہار ہیں لیکن در حقیقت عوامی شرمندگی (دونوں قانونی اور ثقافتی سطح پر) نہ صرف بچ جانے والے متاثرہ فرد یا مرنے والے کے متاثرین کو کسی قسم کی پیشہ ورانہ مدد حاصل کرنے کی راہ میں رکاوٹ بن جاتی ہے بلکہ ایک کلنک کا ٹکہ بن کر زندگی اور اجیرن کر دیتی ہے۔

تیسرے سزا کا یہ قانون انتقام کی خواہش کا اظہار بھی سمجھا جا سکتا ہے کہ انصاف ہوتا بھی نظر آتا ہے کہ ایسی قبیحہ جرم کے مرتکب کو سزا مل گئی، تاہم اس صورت میں یہ فرض کر لیا گیا ہے کہ خودکشی کی کوشش کرنے والے یا کامیابی کی صورت میں

اس کے علاوہ کوئی اور بھی متاثر ہے اور یہ کہ اس کا یہ فیصلہ عقلی لحاظ سے صحیح تھا نہ کہ اس وقت وہ کسی دباؤ یا کسی ذہنی بیماری کے زیر اثر فیصلہ کر رہا تھا۔

مندرجہ بالا دلائل کے ساتھ انٹرنیشنل ایسوسی ایشن بارے انسداد خودکشی(International association for prevention of Suicide) نے دفعہ 335 کو تبدیل کرنے اور خودکشی کو مجرمانہ عمل کے تعریف سے نکالنے کے چار فوائد گنوائے ہیں۔

1 اس قانون میں تبدیلی سے عوامی رائے عامہ بہتر ہو گی اور (stigma) میں کمی سے متاثرہ افراد کے لیے پیشہ ورانہ مدد حاصل کرنا آسان ہو گا۔

2 قانون میں تبدیل (decriminalisation)سے خودکشی جیسے عمل کو سمجھنے میں آسانی ہوگی اور متاثرہ فرد کی جلد نشاندہی اور امداد کے طریقوں کو آزمایا جا سکے گا۔

3 قانون میں تبدیلی (decriminalisation)سے خودکشی جیسے اقدام کو پبلک ہیلتھ کے مسئلہ ٔ کے طور پر لیا جا سکے گا اور متاثرہ افراد کا بیمار کے طور پر علاج کیا جا سکے گا۔

4 قانون میں تبدیلی سے اس ذہنی اذیت سے نجات ملے گی جو ممکنہ قانونی چارہ جوئی اور قید کی سزا کی لازمی حصہ ہے۔

اس ساری بحث امید ہے کہ یہ بات واضح ہو گئی ہو گی کہ مروجہ قانون میں تبدیلی کی ذمہ داری صرف قانون ساز اداروں اور ان کے اراکین پر ہی نہیں چھوڑی جا سکتی بلکہ ہمیں دوسرے ممالک کے تجربوں سے فائدہ اٹھانا ہو گا اور جہاں سول سوسائٹی کے سطح پر اس بارے میں ایک مہم کے ذریعے عوامی بیداری میں اضافہ کرنا ہو گا۔ وہیں ہمارے قانون سازوں پر بھی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ جدید تحقیق کی روشنی میں خودکشی جیسے پیچیدہ المیہ اور اس سے وابستہ عوامل کو سمجھ کر ایسی قانون سازی کریں جو انسانی زندگی میں آسانیاں لا سکے اور ان رویوں کو درست کرنے میں مدد گار ہو جو انسانی صحت پر منفی اثرات رکھتے ہیں۔ یہاں یہ بات یاد رکھنا ضروری ہے کہ سینٹ اور اسلامی نظریاتی کونسل اس سلسلے میں پہلے ہی (2017 میں) اپنے رائے کا اظہار کر چکے ہیں اور ابھی تک کوئی ایسی تحقیق سامنے نہیں آئی جو اس تاثر کو درست ثابت کرے کہ دفعہ 335 میں ترمیم خودکشی کے رجحانات کو زیادہ کر دے گی۔

غزل

باصر سلطان کاظمی MBE

دل لگا لیتے ہیں اہلِ دل وطن کوئی بھی ہو
پھول کو کھلنے سے مطلب ہے چمن کوئی بھی ہو

صورتِ حالات پر ہی بات کرنی ہے اگر
پھر مخاطب ہو کوئی بھی، انجمن کوئی بھی ہو

تارِ گیسو یا رگِ گُل سے ہوئے ہم بے نیاز
دار تک جب آگئے عاشق، رسن کوئی بھی ہو

ہے وہی لاحاصلی دستِ ہنر کی منتظر
آخرش سر پھوڑتا ہے، کوہکن کوئی بھی ہو

ہیں جو پُر از آرزو ہوتے نہیں محتاجِ مے
رات دن مخمور رکھتی ہے لگن کوئی بھی ہو

ہے کسی محبوب کی مانند اس کا انتظار
دیدہ و دل فرشِ رہ ، مشتاقِ فن کوئی بھی ہو

شاعری میں آج بھی ملتا ہے ناصر کا نشاں
ڈھونڈتے ہیں ہم اسے بزمِ سخن کوئی بھی ہو

عادتیں اور حاجتیں باصرؔ بدلتی ہیں کہاں
رقص بِن رہتا نہیں طاؤس بَن کوئی بھی ہو

☆☆☆☆

غزل

ڈاکٹر قیصر عباس زیدی

جہاں کا پھول ہوں میں، اُس چمن میں رہتا ہوں
وطن سے دور ہوں لیکن وطن میں رہتا ہوں

نہ ڈھونڈ مجھ کو کہیں اور اے نسیمِ سحر
شمیمِ گل ہوں میں، سرو و سمن میں رہتا ہوں

وہاں نہیں ہوں مگر دل وہیں پہ ہے میرا
اکیلا ہوں میں مگر انجمن میں رہتا ہوں

پہن رکھی ہے دل و جاں نے دیس کی خوشبو
جہاں بھی جاؤں اسی پیرہن میں رہتا ہوں

وہ جس کی گود نے پالا تھا مجھ کو بچپن میں
میں آج بھی اُسی کوہ و دمن میں رہتا ہوں

سجائے رکھتا ہوں یادوں کی بزم کو ہر دم
ہمیشہ محفلِ شیریں سخن میں رہتا ہوں

وہ اُس کی نقرئی صبحیں ، وہ سرمئی شامیں
میں شہرِ زیست کے ہر بانکپن میں رہتا ہوں

مرے مزاج سے واقف وہی تو ہیں قیصؔر
رہوں کہیں بھی میں اہلِ سخن میں رہتا ہوں

☆☆☆☆

علامہ اقبال کے نام

ڈاکٹر قیصر عباس زیدی

بوئے گُل، حسنِ چمن، صورتِ لالہ لکھا
اُس نے قسمت میں مسلماں کی اُجالا لکھا

شخصیت اُس کی تھی جیسے ہو فلک بوس پہاڑ
اولیں حرفِ سخن جس نے ہمالہ لکھا

وہ تھا اقبال بلندی پہ نظر تھی اُس کی
شوقِ منزل میں ستاروں کا حوالہ لکھا

اُس کے اشعار معانی کا سمندر جیسے
گویا جو حرف بھی لکھا وہ مقالہ لکھا

عدل کا اُس کے تقاضا تھا لکھا پست کو پست
اور بالا جسے سمجھا اُسے بالا لکھا

لکھا اَوروں نے بھی ہر دور میں لیکن اُس نے
منفرد لکھا ، جدا لکھا ، نرالا لکھا

میں نہیں کہتا یہ کہتے ہیں سخنور سارے
جو لکھا حضرتِ اقبال نے اعلیٰ لکھا

☆☆☆☆

غزلیات

ڈاکٹر اکمل مخدوم

کیوں مجھے راس آگئی ہیں ہجر کی تنہائیاں
مجھ پہ کیوں پڑتی نہیں ہیں پیار کی پرچھائیاں

ارتعاشِ سطحِ اُلفت کو نہیں سمجھا گیا
کیسے سمجھائے گا کوئی عشق کی گہرائیاں

کر دیا ہے مضمحل دل کو تمہارے قہر نے
یہ نہیں اب لے سکے گا پیار کی انگڑائیاں

☆☆☆☆

بیتے لمحوں کی ابتلا کہیے
کہیے کہیے مجھے برا کہیے

اُس نے دیکھا، پلٹ کے پھر دیکھا
اُس کی کیسی تھی یہ ادا کہیے

ہچکچانے کا فائدہ اکمل
دل جو کہتا ہے برملا کہیے

☆☆☆☆

تم مری کائنات کیا جانو
آسمانوں کی بات کیا جانو

حشر آیا ہی چاہتا ہے اب
تم قیامت کی بات کیا جانو

مت بناؤ یہ زندگی مشکل
کیوں ہے یہ نفسیات کیا جانو

یہ مسائل یہ مشکلیں پیارے
ان سے کب ہو نجات کیا جانو

آسماں کیوں سمجھ نہیں پاتا
میری سادہ سی بات کیا جانو

جو تکبر کرے گا روئے گا
تم یہ اخلاقیات کیا جانو

رات دن کے غلام ہو اکملؔ
اس سے بالا ہے بات کیا جانو

☆☆☆☆

غزل

ڈاکٹر مقصود احمد

سوچوں کے سمندر میں بھی طوفان بپا ہے
کس درجہ خطرناک میرے گھر کی ہوا ہے

اس گھر کے مکیں دھرتے ہیں ہر ایک پہ الزام
اے میرے خدا تو ہی بتا کون کھرا ہے

جو میرے مقدر کا اندھیرا ہے ہر اک سو
دنیا کی نظر میں تری زلفوں کی گھٹا ہے

یزداں کی مشیت ہے تو پھر میں بھی ہوں راضی
اس نے جو دیا فیصلہ وہ ٹھیک دیا ہے

یہ لوگ بچھاتے رہے ہر راہ میں کانٹے
ہمت کا مسافر تھا جو چلتا ہی رہا ہے

سو بار تو کی آپ نے توہین وفا کی
ہر بار مگر ہم پہ ہی الزام لگا ہے

اُس گھر کی بہاریں تو ہوئیں خواب کی صورت
اِس گھر کی بہاروں کا خدا روٹھ رہا ہے

اُس سے تو عبث ہی ہے عنایت کی توقع
جس کو نہیں معلوم کہ کیا عہدِ وفا ہے

جس کے لیے مقصودؔ جی الجھے ہیں سبھی لوگ
سوچیں تو بلا کونسی وہ ایسی خطا ہے

سوچاں

ڈاکٹر مقصود احمد

بندے نوں ایہ سوچاں یا رو
اِکوّ ویلے
ڈو بن تارن

جہیڑا بندہ ایس جہانیں
نہ کچھ دیکھے، نہ کچھ چاکھے
اوہوسب توں چنگا بندہ
ایس جہانیں جہیڑا سوچے
لو کی اوہنوں جھلّا آکھن
کیوں نہ آکھن !

سوچاں سوچ کے
اپنے آپ نوں
وچ غماں دے سٹ لیندا اے
میں دی یارو
کچھ دِناں توں

سوچاں کولوں دور رہنا واں
سچی مُچی جھوٹ نئیں کہندا
ہولا ہولا لگتا واں

نثری نظم

ڈاکٹر سعدیہ محمد

یہ طلب اے جستجو ہے
سکون کی، قرار کی

تم مطمئن ہو جاؤ
مجھے اطمینان مل جائے

ایک دوسرے کی کمی بیشی
برداشت کر لیں، نظر انداز کر لیں

تم مجھے ایسے ہی قبول کر لو
میں تم سے ویسے ہی راضی ہو جاؤں

شاعرانہ اظہارِ خیال

ڈاکٹر سعدیہ محمد

یہ احساس۔ اے۔ حسرت کیسی، یہ حال اے رشک کیسا
ہاتھ جب وہ لائے تھے سامنے، خود ہی نہیں تھاما

دروازہ کھول رکھا تھا، ہمارے استقبال کے لئے
راستہ ہم نے بدل لیا، ہم ہی نہ چلے آگے

اب جو دوراہے پر کھڑے ہیں ہم بھی اور وہ بھی
مل سکتی نہیں لیکن لکیریں تقدیر کی

بس سنبھل جا اے دل، یہ خیال و گمان کر لے
ضروری نہیں کہ سفر۔ اے۔ زندگی حسین ہوتی انہی سے

ڈھونڈ اپنے نصیب میں کشش، ہو اس سے مطمئن
کہ شمع جلانے سے غروب۔اے۔آفتاب نہ ہو گا کبھی

Time to go back to the couch.

Professor Tanveer Rana

For decades outrageous indignities have been heaped upon Freud. There have been merciless attacks on him as a person, and relentless assaults on his work. He has been called all imaginable names under the sun including being a sadist; a liar; a charlatan; a cheater; a builder of myths; a crank; a quack; a cocaine addict; an ingenious plagiarist; a dogged and ruthless self-promoter, and a scoundrel. Over the years Freud's opponents have taken a sharply polarized and very prejudiced view and have launched a torrential rain of vehement arguments against psychoanalysis. According to Esterson, "the rise of psychoanalysis to a position of prominence in the twentieth century is one of the most extraordinary aberrations in the history of Western thought" (Esterson, 1993).

There have been numerous and very passionate 'movements' to bury Freud. To the utter dismay of anti-Freudians, Freud is very much alive. No matter how fierce the movements are against him and irrespective of how many vigorous attempts are made to bury him, Freud can never be buried or dismissed. This is because Freud's achievement was both artistic as well as scientific (Wilson, 1972). His followers believe that "he was the central imagination of our age" (Friedman, 2001), and "a genius whose ideas revolutionized our understanding of ourselves" (Lemma, 2003). Alessandra Lemma says: "Psychoanalysis, more than any other psychological theory, gets the measure of us by focusing squarely both on our desire and our destructiveness. It is the most intellectually satisfying view of the mind" (Lemma, 2003).

John F. Kihlstrom, a staunch anti-Freudian, admits that more than Einstein or Watson and Crick, more than Hitler or Lenin, Roosevelt or Kennedy, more than Picasso, Eliot, or Stravinsky, more than the Beatles or Bob Dylan, Freud's influence on modern culture has been profound and long-lasting (Kihlstrom, 2000). Even Charles Darwin and Karl Marx have not commanded more attention than Freud.

There is no denying the fact that Freud got the ball rolling and has the unprecedented credit for kindling a revolution in psychology. Much of today's psychotherapeutic work is still predicated or based on many of Freud's original insights. Needless to say, the main ideas of psychoanalysis are at the foundation of many forms of psychotherapy. Many therapies, including cognitive and humanistic therapies, evolved from psychoanalysis, (Summers & Barber, 2009). A. T. Beck, Fritz Perls and Albert Ellis were all trained as psychoanalysts, and they modified psychoanalysis to develop their own therapies. Of course, some areas of Freud's findings have been refined and expanded, while some other ideas have been abandoned. Even if some of Freud's ideas or theories are wrong, we should be cautious not to throw the baby out with the bathwater. Moreover, in any scientific research some findings are sometimes refuted or disproved later on. This is how advancement generally takes place.

There is ample evidence that the tide now seems to be turning again in Freud's favour (Burkeman, 2016). In this review article, we have first mentioned some personal facts about Freud. The main tenets of psychoanalysis are then explained. We have subsequently reviewed the empirical evidence for psychoanalysis and highlighted recent scientific discoveries which support some of the psychoanalytical ideas.

Contrary to what his opponents would like us to believe, Freud tried his best to keep an open mind and was not as dogmatic as has been propagated. He was driven all his life, by what his biographer Jones calls 'a divine

passion of knowledge'. He was fluent in seven languages as well as German. Freud was passionate about English literature, which he read in original.

From an early age Freud had immense self-confidence. He once heard Charcot saying that many nervous disorders can be traced to the 'genital thing'. While others were hesitant to speak about this in public, Freud dared to speak the unspeakable truths about human behaviour. He readily portrayed a gloomy and an unflattering picture of human beings. He asserted that we are driven by sexual and aggressive urges and by thoughts, feelings and wishes that conflict with each other and are concealed from our conscious awareness.

Freud stated that our behaviour was not always determined by us consciously, but by irrational forces outside our conscious awareness and control. For anti-Freudians, the notions that human beings are jealous, envious and rivalrous, and that the trustworthiness of human beings is questionable, are difficult to accept. Jonathan Lear writes that Freud is a deep explorer of the human condition, working in a tradition which goes back to Sophocles, Plato, Saint Augustine, Shakespeare, Proust and Nietzsche. According to these thinkers, there are significant meanings for human well-being which are obscured from immediate awareness (Lear, 1995).

It is true that Freud did not discover the unconscious mind - that glory goes to French psychiatrist Pierre Janet. Before Freud, Goethe and Schiller had alluded to the unconscious mind and looked to it for the roots of creativity. However, Freud was the first person who recognised clearly the mystery and power of the unconscious mind. This is perhaps his most remarkable achievement. He realized that our unconscious mind has secret feelings, wishes and fears. Freud's premise that much of mental life is unconscious has been extensively validated by research in the field of experimental psychology (Westen, 1999).

One important contribution of Freud is the art of listening which is the key skill in psychotherapy and psychiatry. It was Freud who raised the technique of listening to an expert level unexplored in earlier eras (Mohl & Carr, 2015). Another discovery of Freud was that some patients may be ambivalent about getting better and unconsciously (or consciously) oppose attempts to help them (Gabbard, 2007).

Psychodynamic concepts of transference, catharsis and defence mechanisms hold significant relevance. It is a well-established fact that we regularly employ such defences as denial, repression, projection, intellectualization, and rationalization.

Credit also goes to Freud for highlighting the immense importance of sexual impulse. However, the insight so dazzled him that he proceeded to apply it generally and indiscriminately to every field and problem that arose. Religion, art, wit, altruism, they were all 'rationalized manifestations of the sexual impulse'. This is the fundamental criticism of Freud (Wilson, 1972).

Another contribution of Freud is regarding dreams. Widely considered the founder of modern dream analysis, Jonathan Winson, has bridged the fields of psychoanalysis and neurobiology. Winson states that, although

Freud's conclusions were off the mark, his intuition of its existence was correct: "He is right that there is a coherent psychological structure beneath the level of conscious. That's a marvellous insight for which he deserves credit. And he deserves credit too for sensing that dreams are the 'royal road' to the unconscious" (Winson, 1990).

Psychodynamics would involve recognizing that people are not always aware of the reasons for their behaviour that human motivations are to some extent rooted biologically and that they are often driven by unknown motives. However, unlike the previous practice where the complete focus of psychodynamic psychotherapy was on interpretation of unconscious conflict, psychoanalytic therapists now recognize that there are multiple modes of therapeutic action that vary from patient to patient (Gabbard & Westen, 2003).

There are multiple goals of psychodynamic psychotherapy. One basic goal is to expand the patient's awareness of unconscious conflicts, feelings, wishes, fantasies, and motivations. Psychodynamic therapists look for past patterns in life especially in relationships. How do past patterns are repeated in the present life and with the therapist? What recurrent conflicts are playing a role in the patient in other settings? The therapist seeks to formulate the interpretations of these unconscious patterns. Another task is to increase the patient's awareness of problematic attachment patterns so that new and different modes of attachments to others are possible. Therapists try to help patients understand how they lie to themselves, hide from themselves, and try to project their own conflicts and feelings on to others. Fostering insight and the therapeutic relationship itself are arguably the primary modes by which change is brought about in psychoanalytic therapy. One of the ways that insight can be fostered is to encourage free association.

Peter Fonagy and Alessandra Lemma say that the psychoanalytical approach can provide a useful and unique contribution to modern healthcare (Fonagy & Lemma, 2012). While some of the concepts of psychoanalysis are hard to test empirically, some ideas have received lot of empirical support.

Cognitive-behavioural psychotherapies have traditionally been seen as more scientific or effective than psychoanalytic therapy. While cognitive-behavioural approaches are increasingly based upon clinically rather than experimentally derived models, psychodynamic practice has been enriched by findings in developmental psychology (Mace & Moorey, 2001). New studies have cast doubt on the supremacy of CBT (Burkeman, 2016). Studies have shown that the effects of CBT are falling (Johnsen & Friborg, 2015). Some therapists have advocated the integration of dynamic psychotherapy and behaviour therapy and have successfully experimented with this combination, obtaining encouraging results (Birk, 1970; Fensterheim, 1993). Studies have demonstrated that psychodynamic therapy, although more expensive than CBT, is able in some circumstances to pay for itself thanks to reduction in offset-costs, medication, hospital stays, welfare payments etc. (Bateman & Fonagy, 2003).

A number of meta-analyses of dynamic psychotherapy published in high impact journals have generally shown that psychoanalytic therapies are indeed effective. The psychodynamic approach has been given credibility by a

substantial body of research on brief psychodynamic therapy; the authors found that there were no differences between short term psychodynamic psychotherapy and other forms of psychotherapy (Leichsenring, Rabung & Leibing, 2004).

In one meta-analysis, psychodynamic therapy was compared with other psychotherapies. Fourteen of the 17 study comparisons had no significant differences. In one, psychodynamic therapy was found to be more effective, and in two, the other treatments were found to be more effective (Luborsky, Diguer, Luborsky & Schmidt, 1999).

In one study, 38 patients with borderline personality disorder who received the psychoanalytically oriented treatment showed significantly more improvements in depressive symptoms, social and interpersonal functioning, need for hospitalization, suicidal and self-mutilating behaviour (Bateman & Fonagy, 1999). These differences were maintained during an 18-month post-treatment follow-up period with assessments every six months (Bateman & Fonagy, 2001). Moreover, the treatment group continued to improve during the 18-month follow-up period.

Swartberg and colleagues randomly assigned 50 patients with a diagnosis of cluster C personality disorders to 40 sessions of either dynamic psychotherapy or cognitive therapy. All patients showed statistically significant improvement during treatment and after a two-year follow-up. Patients who received cognitive therapy did not report significant change in symptom distress after treatment, whereas patients who underwent dynamic therapy treatment did (Swartberg, Stiles & Seltzer, 2004).

In a large study, 763 children were evaluated and given psychoanalytic treatment at the Anna Freud Centre in London. Children with phobias and severe emotional disorders did well, whereas those with depression did not (Target & Fonagy, 1994a; Target & Fonagy, 1994b).

One study found that long-term psychodynamic psychotherapies produce large within-group effect sizes, comparable to those achieved by other psychotherapy modalities. The researchers asserted that gains tended to accumulate even after therapy had finished, in contrast to non-psychotherapeutic treatments (Leschenring & Rabung, 2011).

Busch and colleagues have developed time-limited, evidence based psychodynamic therapy for anxiety, concentrating particularly on the role of unconscious unexpressed anger, demonstrating good outcomes in 21 sessions compared with controls (Busch, Milrod & Sandberg, 2009).

Two manualized and modified psychodynamic therapies, Mentalization Based Therapy (Bateman & Fonagy, 2004) and Transference Focussed Therapy (Clarkin, Levy, Lenzenweger & Kernberg, 2007), have demonstrated significant improvements for borderline personality disorder sufferers compared with treatment as usual controls.

A number of other studies have found that the outcome of psychodynamic therapy does not differ from alternative therapies for treating different psychiatric disorders such as depressive disorders and personality disorders (Leichsenring, 2001; Leichsenring & Leibing, 2003; Leichsenring, Rabung & Leibing, 2004).

According to David Malan, anyone truly impartial cannot fail to accept certain psychodynamic phenomena as scientific facts. This applies, for instance to 'defence, anxiety, and hidden feeling' and hence the existence of 'the unconscious'; the 'return of the repressed'; 'transference'; and the validation of these concepts through direct observation of the response to interpretation (Malan, 1995).

Proponents of psychoanalysis say that there are numerous areas of mutual interest for psychodynamic practice and contemporary scientific research (Holmes, 2012). It is a well-established finding that psychiatric disorders result from interaction between genetic susceptibility and environmental factors. A combination of a psychodynamic viewpoint and recent research supports this in two distinct ways. First, environmental susceptibility can both enhance health as well as trigger illness. A second growth point for psychodynamics is in the newly invented niche of neuro-psychoanalysis (Pankseep, 2004; Solms & Turnbull, 2002). According to Jeremy Holmes, "Psychoanalysts in research for scientific credibility can now visualise physical correlates of their black-box postulates, while neuroscientists learn from psychoanalysis how meanings emerge from brain biology" (Holmes, 2012).

Neuroscientist, psychiatrist and Nobel Prize winner, Eric Kandel has advocated an approach based on the 'rigorous empirical framework of molecular biology yet incorporating the humanistic concept of psychoanalysis' (Kandel, 1999).

One important research has implications for empathy and 'projective identification' (Waddell, 1998). Mirror neurones are neurons that are activated in a person's motor cortex when they observe another carrying out an action. Another important neuro-psychoanalytic concept is that of neuroplasticity: the idea that the brain is constantly changing, growing, pruning, remaking connections and circuits (Schore, 2001). The neuro-ameliorative impact of psychotherapy can now be tracked using

neuroimaging techniques such as functional magnetic resonance imaging (fMRI) which can show how the brain changes in response to therapeutic interventions (Holmes, 2012; Karlsson, 2011). From these robust research findings, it is quite apparent that contemporary psychoanalysis is increasingly compatible with a scientific world view. It is evidence based, effective, and can make a significant contribution to contemporary medical science (Holmes, 2012).

Freud was a Darwinian and saw psychoanalysis as an evolutionary science (Sulloway, 1979). Nothing in psychology has stimulated so much research as Freud's ideas. His insights helped us to investigate the unknown territories of the human mind. His inferences and discoveries have changed our image of ourselves. The Berggasse 19, in Vienna is the second most famous street in the world (the first is 10 Downing Street), and Freud

remains the highest quoted person in world history even when all the academic disciplines are combined. In the epigraph to his monumental work, The Interpretation of Dreams, he insightfully wrote: “If I cannot move the heavens, I will stir up the internal regions”. Even if he was mistaken in some ways, Freud presented interesting ideas for later researchers. Many were his disciples who later developed their own theories and therapies. Those offsprings should not forget their origins. As S. Heller says, “If we see further today, it’s because we sit on Freud’s shoulders” (Heller, 2005).

AUTHORS

1.Sana Rana
Trainee psychologist, University of Leicester

2.Dr Arsal Wazir Rana
Clinical Psychologist, Solihull Early Intervention Service, Birmingham

3.Dr Tanvir Ahmad Rana
Visiting Professor of Mental Health
University of Staffordshire, and Wagner College , New York
(All correspondence to be addressed to Dr Arsal Wazir Rana)

REFERENCES

Bateman, A. & Fonagy, P. (1999). The effectiveness of partial hospitalization in the treatment of borderline personality disorder: a randomised controlled trial. American Journal of Psychiatry, 156, 1563-1569.

Bateman, A. & Fonagy, P. (2001). Treatment of borderline personality disorder with psychoanalytically oriented partial hospitalization: an 18 month follow-up. American Journal of Psychiatry, 158, 36-42.

Bateman, A. & Fonagy, P. (2003). Health utilisation costs for borderline personality disorder patients treated with psychoanalytically oriented partial hospitalization versus general psychiatric care. American Journal of Psychiatry, 160, 169-171.

Bateman, A. & Fonagy, P. (2004). Psychotherapy for borderline personality disorder: mentalization based treatment. Oxford: Oxford University Press.

Birk, L. (1970). Behaviour therapy - integration with dynamic psychiatry. Behaviour Therapy, 1(4), 522-526.

Burkeman, O. (2016, January 7). Therapy wars: the revenge of Freud. The Guardian. Retrieved from https://www.theguardian.com

Busch, F., Milrod, B. & Sandberg, L. (2009). A study demonstrating the efficacy of a psychoanalytic psychotherapy for panic disorder – implications for psychoanalytic research and practice. Journal of the American Psychoanalytic Association, 57, 131-148.

Clarkin, J. F., Levy, K. N., Lenzenweger, M. F. & Kernberg, O. F. (2007). A multi wave RCT evaluating three treatments for borderline personality disorder. American Journal of Psychiatry, 164, 922-928.

Esterson, A. (1993). Seductive mirage: an exploration of the work of Sigmund Freud. La Salle, Illinois: Open Court Books.

Fensterheim, H. (1993). Behavioural psychotherapy. In G. Stricker & J. Gold (Eds.), The comprehensive handbook of psychotherapy integration (pp. 73-85). New York: Plenum.

Fonagy, P. & Lemma, A. (2012). Does psychoanalysis have a valuable place in modern mental health services? Yes. The BMJ, 344, doi: http://dx.doi.org/10.1136/bmj.e1211

Friedman, D. (2001). A mind of its own: a cultural history of the penis. New York: The Free Press.

Gabbard, G. O. (2007). Major modalities: psychoanalytic/psychodynamic. In G. O. Gabbard, J. S. Beck & J. Holmes (Eds.), Oxford textbook of psychiatry (pp. 3-13). Oxford: Oxford University Press.

Gabbard, G. O. & Westen, D. (2003). Rethinking therapeutic action. International Journal of Psychoanalysis, 84, 823-841.

Heller, S. (2005). Freud A to Z. New Jersey: John Wiley & Sons.
Holmes, J. (2012). Storr's the art of psychotherapy. Boca Raton: CRC Press.

Johnsen, T. J. & Friborg, O. (2015). The effects of cognitive behavioral therapy as an anti-depressive treatment is falling: a meta-analysis. Psychological Bulletin, 141(4), 747-768.

Kandel, E. R. (1999). Biology and the future psychoanalysis: a new intellectual framework for psychiatry revisited. American Journal of Psychiatry, 156, 505-524.

Karlsson, H. (2011). How psychotherapy changes the brain. Psychiatric Times, 20-28.
Kihlstrom, J. F. (2000). Is Freud still alive? Freud's influence on psychology has been that of a dead weight. In R. Atkinson, R. Atkinson, E. Smith, D. Bem, & S. Nolen-Hoeksema (Eds.), Hilgard's introduction to psychology (p. 481). New York: Harcourt Brace Jovanovich.

Lear, J. (1995, December 25). A counterblast in the war on Freud: the shrink is in. The New Republic. Retrieved from http://human-nature.com

Leichsenring, F. (2001). Comparative effects of short-term psychodynamic psychotherapy and cognitive-behavioural therapy in depression: a meta-analytic approach. Clinical Psychology Review, 21(3), 401-419.

Leichsenring, F. & Leibing, E. (2003). The effectiveness of psychodynamic therapy and behaviour therapy in treatment of personality disorders: a meta-analysis. American Journal of Psychiatry, 160(7), 1223-1232.

Leschenring, F. & Rabung, S. (2011). Long-term psychodynamic psychotherapy in complex mental disorders: update of meta-analysis. British Journal of Psychiatry, 199, 15-22.

Leichsenring, F., Rabung, S. & Leibing, E. (2004). The efficacy of short-term psychodynamic psychotherapy in specific psychiatric disorders. Archives of General Psychiatry, 61(12), 1208-1216.

Lemma, A. (2003). Introduction to the practice of psychodynamic psychotherapy. Chichester: Wiley.
Luborsky, L., Diguer, L., Luborsky, E. & Schmidt, K. A. (1999). The efficacy of dynamic versus other psychotherapies: is it true “everyone has won and all must have prizes”? - an update. In D. S. Janowsky (Ed.), Psychotherapy indications and outcomes (pp. 3-22). Washington, DC: American Psychiatric Press.

Mace, C. & Moorey, S. (2001). Evidence in psychotherapy: a delicate balance. In C. Mace, S. Moorey & B. Roberts (Eds.), A critical guide for practitioners (pp. 1-11). East Sussex: Brunner- Routledge.

Malan, D. H. (1995). Individual psychotherapy and the science of psychodynamics. Boca Raton: CRC Press.

Mohl, P. C. & Carr, R. B. (2015). Listening to the patient. In A. Tasman, J. Kay, J. A. Lieberman, M. B. First & M. B. Riba (Eds.), Psychiatry, fourth edition (pp. 3-18). Chichester: John Wiley & Sons

Pankseep, J. (2004). Affective neuroscience: the foundations of human and animal emotions Oxford: Oxford University Press.

Schore, A. (2001). The right brain implicit self lies at the heart of psychoanalysis. Psychoanalytic Dialogues, 21, 75-100.

Solms, M. & Turnbull, O. (2002). The brain and the inner world. New York: Other Press.

Summers, R. J. & Barber, J. P. (2009). Dynamic psychotherapy: a guide to evidence based practice. New York: Guildford Press.

Sulloway, F. J. (1979). Freud: biologist of the mind. New York: Basic Books.

Swartberg, M., Stiles, T. & Seltzer, M. H. (2004). Randomised controlled trial of the effectiveness of short-term dynamic psychotherapy and cognitive therapy for cluster C personality disorders. American Journal of Psychiatry, 161, 810-817.

Target, M. & Fonagy, P. (1994a). The efficacy of psychoanalysis for children. Prediction of outcome in a developmental context. Journal of the American Academy of Child and Adolescent Psychiatry, 33, 1134-1144.

Target, M. & Fonagy, P. (1994b). The efficacy of psychoanalysis for children with emotional disorders. Journal of the American Academy of Child and Adolescent Psychiatry, 33, 361-371.

Waddell, M. (1998). Inside lives: psychoanalysis and the growth of the personality. London: Karnac Books.

Westen, D. (1999). The scientific status of unconscious process: is Freud really dead? Journal of the American Psychoanalytic Association, 47, 1061-1106.

Wilson, C. (1972). New pathways in psychology. Maslow & the post-Freudian revolution. NC: Maurice Bassett Publishing.

Winson, J. (1990). The meaning of dreams. Scientific American, 54-61.

اسلامی نظام حکومت ۔ از مولانا ابو العلی مودودی
انٹرویو، ریڈیو پاکستان
انٹرویو ابن انشا

How Islamic Society could be Established A Critique

تنقیدی مکالمہ از محمد اکمل مخدوم

This is a critical discussion on an interview that Maulana Maududi gave to Radio Pakistan in 1977. It was given to the famous broadcaster, poet and author, Ibne Insha. Recorded in the aftermath of the removal of the then prime minister Zulfiqar Ali Bhutto's government by general Ziaulhaq, in this lengthy interview, the renowned scholar and religious expert enumerated three basic principles of the state that was established on the principles of Islam. He used the example the state of Madinah and Makkah, established by prophet of Islam, Mohammad, peace be upon him.

Maulana Maududi stated that the first principle was that in any Islamic system of government, the only ruler was Allah/God. That being the paramount rule; and the only governance was the governance of God alone, not of man. Then came the principle that God's guidance came to mankind indirectly but through prophets. The word of God was revealed not to man but to mankind through a third party: prophets. In third, came the concept of the day of judgement.

In his explanation maulana said that the concept of supremacy was entirely contained within the principle of supremacy of God's law, God being supreme ruler. He said that it was God's earth, the seasons were created by God; all living beings were created by God; life and death were created by God; heavens and the universe were created by God. So, supremacy must be and is, of God. In expansion of his second principle: that mankind did not get direct messages by God, but God chose prophets, established that third party's superiority. His inference being that there was a third party in the state of Madina, the custodian of the message of God. Similarly, there would be a third party in all Islamic systems who would impart God's guidance to mankind; would reign over the rest. This was since God gave prophets His message which were then distributed to mankind. In his assessment the only link of communication between man and God, and conveyance of His word was via third party.

Describing his third principle maulana said that mankind could not evolve if it were not confronted with the concept of judgement day; no one could become perfect. None would strive for perfection or do good in community unless there was established the concept of the day of judgement. He seemed to suggest that a judgement was essential, to ascertaining human behaviour, where virtue was rewarded, and vice punished. These were the main three principles he described as for pillars of an Islamic government. He believed that such a state was created by Prophet Muhammad, peace be upon him.

Maulana's thesis raised certain questions which could nullify some of his prepositions that he propounded.

In his first supposition, he stated that supremacy of rule was enshrined in God, because He was the creator of everything. So, supreme ruler was God on the Earth.

This view is challenged by scripture; verses that exhort in the book that God created a vice Regent, a viceroy, a ruler on earth, which He called his caliph on Earth. He made that caliph who would run his own affairs; and manage affairs of the world; in a system which was laid down in the book. Principles of that Godly system were given in the book.

So, if we see the counter narrative of maulana's first concept, God, in his own book, clearly said that He created man as ruler on earth. This majesty of man was one miniscule rule: the trillionth of the trillionth of the trillionth, amongst all the vast universe of God and His unlimited dimensions. On this little tiny speck, which is invisible from only a few light years away, He made the miniscule man as in-charge of affairs. So, we may infer from this that maulana's assertion may be counter balanced if not outrightly contradicted. In the first instance, God also stated in his book that God made innumerable bounties and creations for man: He created seasons; for man he created bounties which grow from the earth; fruits and flowers; birds and beasts of burden; wooden ships, large and small; flowing streams and rivers for man to enjoy; He gave food in hunger, and quenched thirst.

Repeatedly, God swears to man, swearing on the bounties God gifted man. So, the argument maulana propounded weakens by scripture: that man is the caliph, and this world is for mankind, bequeathed by God to man. At the same time, God's omnipotence is unquestionable. He is the ultimate authority in everything; as creator of everything. But man's authority on this earth is established by God Himself. Man's control on earth and the purpose of bounties of this earth are all for man.

In regards the first principle, He gave mankind the authority to agree and disagree; to accept and reject; to say yay and nay. So, while the supreme authority across the universe is indeed God's, but, to on this miniscule Earth, to this extent, He gave supremacy to his tiny creation: man. God gave man authority to refuse all or accept all or agree partially or not.

The intent of God did not appear to completely assert His rules. He gave his creation on whom he sent his message, capacity, and ability, to say no. so, this suggests that God did not wish his message to be imposed. Otherwise, He would not have granted mankind the ability to refuse. He gave man the ability to choose. This proves that God did not wish to assert total authority on earth. it is not God's will to rule the earth. He has, pro tem, granted this authority of saying yes or no to his creation: man.

In the second instance, there is an inherent contradiction that springs out from maulana's inference. His second principle: that God has given man his message through a third party, is, with respect, incorrect. Once again, in God's book, He consistently stated that He sent his message to mankind "from amongst their own kith and kin".

In God's book, God stated that he sent his prophets to mankind from amongst their own nations. All prophets of God were from amongst their own people. They were mortal men. And, not third parties, as maulana asserted. If we facetiously presume that Maulana meant that God did not send his message onto every human being directly, en mass, then that would be correct. But neither did God give his message through third parties: Angels, Jinns nor cherubs nor flying creatures in clouds nor he gave it to any other species on Earth except man. So, to say that God transmitted his message through a third party, does not stand. All prophets were men; all prophets lived and died or were removed from the world in accordance with God's wish. They were mortals. They were born naturally. They were born of mothers and except for one, who was from the light of God created in his mother's womb, all prophets had fathers. All prophets were part of humanity. So, to suggest that a third party was involved in God's communication with man, is not entirely true. There was no third party involved that conveyed the message or received the message from God. His angels came to man. In reference to sovereignty of God on earth instead of God's granted sovereignty to man, and Prophets being distinct from man, and not from mankind, maulana discussed Prophet Muhammad's (peace be upon him) immediate status in Medina. Maulana stated that Prophet Muhammad landed as unquestioned ruler in Madina. But, if we read the Treaty of Medina (Meesaaq e Madinah) it is clear that the prophet was not a ruler. He was the arbiter between tribes and the arbitrator of disputes amongst people. He was an adjudicator, who would adjudicate in accordance what the rules of the treaty of Madina. So, he could not adjudicate from outside the treaty that was the constitution of Madina, as agreed with all parties. This was the Islamic constitution of the first Islamic nation. In that, all customary requirements ordained by participating tribes were incorporated. This was in accordance with their respective scriptures. This meant that he could only adjudicate while he had the trust and the support of those who had appointed him. So, the idea that he was the unquestioned monarch, unchallenged, unrestrained, uncontrolled and unaccountable, is not entirely true. The treaty of Medina was discussed, each clause, by each tribe, agreed in unanimity and consensus, created for unity and compliance. It is clear in all clauses of the constitution of the Islamic nation in Medina that all people were enfranchised. All people of Medina contributed.

That was why it was effective. It engendered trust that they bestowed on Prophet Muhammad, during his life, onto his judgements. These rules were agreed and stipulated by disparate tribes and peoples of Medina. Rules were already laid down: Christians were to be judged on Christian scripture and Christian jurisprudence; Jews were to be judged on Jewish scripture as advised by Jewish leadership and Halacha. Muslims were to be judged on Islamic rules.

This pact was amongst people that they would become part of a community, while retaining social and scriptural identity. A multicultural, diverse, and multi-ethnic society, living in harmony.

Prophet of Islam was a refugee. His companions were refugees, and were called as such, Almahajiroon. The host community was clearly distinct. Both were brought together by this constitution but retained their identities in perpetuity. Despite that, they were encouraged to create fraternal bonds to live together; collaborate and trade together; defend each other and be brothers and sisters alike. So, it is right that this was not a conquest, but acceptance. Maulana Maududi narrated a statement from mother of believers, lady Aisha: that Medina was

conquered by Quran. That meant that there was no sword involved. As stated earlier, it was not conquest but an embrace of spirit, a unity of souls. This happened because the people of Medina invited Prophet Muhammad, Islam and Quran, into their lives. No one conquered anyone. It was mutual respect and love, as enshrined in Islam and by the character of the Prophet of God.

In this regard, there appears to be a contradiction, in fact, and in history. and the version of Maulana Mawdudi that the Prophet was unquestioned ruler; this is not accurate. Prophet adjudicated through consensus, and not through force. He was not a ruler, but an adjudicator, supported and chosen by communities. Tribal communities of Madina conducted their affairs in accordance with their traditions and customs. There was no central manual of living. There were no uniform patterns of behaviours, no uniformity of beliefs. They were all different and they all lived different lives, but together. This was under the patronage of the treaty of Madina, prophet's adjudication; the umbrella of commity and consensus. This was only possible through collaboration of disparate groups of people. They bestowed their faith in prophet of Islam, Muhammad, peace be upon him.

In summary, Mawlana Maududi's thesis of three core principles of Islamic nation state, it is clear that the first two are open to robust challange and refutation based on scripture and history.

The third pillar, according to maulana, is the concept of judgement day. After narrating these three principles, maulana Mawdudi scholarly argues crucial steps in establishing that Islamic nation-state: developmental steps of the state based on Quran. Here Maulana Mawdudi is correct and finds universal acceptance, in what those steps should be. He asserted that as the first step, values and morality of Islam must be instilled in people's minds and actions. Islamic values must shape the character of citizens of the state akin to Madina.

Islam, in his view, could not be established unless members of the community, the citizens of Islamic nation, were trained and become adept at practice of Islamic values, Quranic principles of behaviours modelled in Islam. He emphasised that there was no Islamic system possible without individual transformation. He asserted repeatedly that the foundation of his system of Islamic government could not be established without people being transformed in their personal character. No one could implement Islamic government unless core community preparation was in place. Without that change in character and morality, he acknowledged that no nation or community of Islam could be established. He believed that no state could be sustained based on the rules of Islam, without transformation of individual values leading to transformation of roup morality and ethics. He believed that without transformation of individual character, no change in group character was possible. Without Islamic group character, nation state of Islam could not be established. He believed that it was through such values changing behaviours, when one started speaking the truth; not bearing false witness, social change would come about. This positive transformation in society of speaking the truth and not bearing false witness could not be established if people were still telling lies and bearing false witness.

The questioner asked maulana Mawdudi if that government was exemplary because the person of the prophet was still alive then to guide people. And what to do when there was no such guidance? Mawlana said that there

were two types of conversations the prophet of Islam did with the people. One: where he revealed the word of God; and all Muslims accepted it. No one questioned it and there was no argument. Those who remained Pagan or Christian or Jewish, didn't accept that revelation, and that was not implemented on them because they were citizens protected by the constitution of Medina. The Treaty of Medina made all residents of Madina, Jews, Christians and pagans, as part of Muslim Ummah, the broader comity of Islam. All who were protected under the umbrella of Islamic unity, with multiple in faiths were citizens of State of Madina.

Maulana then described the non-inspired communication of the Prophet. He sought opinions of people. People asked him every time he stated something if it was a revelation or his own opinion. When it was revelation it was declared as such. That became scripture for Muslims. If it were his own opinion, then everybody would give his or her own opinion in equal measure. On multiple occasions what prophet suggested was not accepted and he acquiesced to opinions of others. He acknowledged that those opinions were better. It proved that despite his lofty and extremely respected self, as a man he treated himself equal amongst peers. As a prophet, he was supreme amongst men, being the custodian of the word of God. Here, maulana described those discussions where various opinions were proffered. And if those appeared superior to the ones already presented, Prophet would support those. He gave examples of the battles of Badr, of Ahzab, and the battle of the ditch, in which there were difference of opinion. Numerous suggestions proffered and discussed, and opinions that appeared more substantive were approved. Here again, prophet was not the unquestioned ruler, but the adjudicator. Prophet did not transform the tribal structure into a uniform civic structure. He did not dismantle tribal boundaries except where Muslim tribes had to adhere to the principles laid down by Islam; and non-Muslim tribes had to adhere to treaties they had signed. These were clauses of mutual collaboration and peaceful coexistence during times of peace, and mutual defence, in times of war.

In that decentralised, consensual, broad-based constitutional system, prophet appointed twelve representatives. They oversaw educational and moral matters in Muslim tribes. They taught Islamic principles to those who did not know. Advised on laws of the Quran and principles contained therein, to various tribes who weren't familiar. They were called Naqeeb or declarants or heralds. They taught principles of Islam to tribes they belonged to; consulted with leaders of their tribe on principles of Islam; advised them on how to go about administration of tribes accordingly. These were always, pious, honest, and educated men; experts in matters for which they were appointed. As we know in Islamic history, on one occasion Prophet appointed a lady-companion representative to her tribe to teach principles of Islam.

With these steps, gradually and developmentally, Prophet transformed and reformed tribal systems, changed personal character, and established the rule of law on all, equally.

Prophet appointed representatives from amongst them who had influence; those who had standing; who were honest and respected. He appointed those who were educated; who had knowledge; and who had expertise; who had wisdom; and who knew how to conduct such affairs. He did not pick those who had no knowledge, no experience, and no understanding of what was going on. He chose experienced people. But the key factor was

that they had to be honest and have influence over other people due to their upright character, knowledge, expertise, and honesty in their respective tribes. They were not rulers, but advisors to the leaders of tribes.

It seemed that here, Maulana was supporting a representative model of governance based on merit. But, he may have been interpreting it as such. At the same time, his contention that experts should be appointed from those who had influence over people or whose influence people accepted. Having influence is actually a passive act rather than an active act. In reality, it is that the influenced allow the influence of the influencer upon themselves. It is not the other way around. A potential influencer may not be able to influence anyone unless the influenced accepts influence of the influencer. In this regard, it appears that prophet chose those who were respected; who were believed; who could convince people to change.

At this juncture, maulana made the jugular-point. The crux of the matter. He said that a dishonest, immoral person could not run Islamic affairs. Prophet did not appoint people who could not influence, in that body of his representatives and tribal advisers. He never appointed dishonest and corrupt people. In the state of Madina, corrupt and dishonest people were not allowed to run anything. Maulana Mawdudi believed that no Islamic system could function if any administrator in any matter was dishonest.

Maulana obviously didn't condone hereditary monarchy, as in his book Khilafat aur Mulukiyat (Caliphate and Monarchy) he slated hereditary rule as un-Islamic or semi-Islamic. In this discussion, he restated that hereditary monarchy system, although not entirely Islamic, was possibly semi-Islamic, but even then, principles of Islam were administered. Muslims who were honest, with strong moral values, and high education, were running matter honestly, in general. He analysed that until the 17th and 18th centuries, that was the case. Once our systems were changed by English-controlled colonial system, that changed our economic, cultural, and educational systems, our moral decay started and had not stopped since. We had not been able to transform our educational and economic systems. English colonialism introduced structures that turned our education and social systems upside down. Through those structural changes, dishonest and corrupt people were absorbed. Those colonial systems encouraged deceit, corruption and dishonesty, in contrast to moral, ethical Islamic education and training. Systems grounded in Islam taught honesty, truth, uprightness; separation of halal and Haram; moral from immoral; the right from wrong. Those systems were discarded by the British Colonialists.

Without those Islamic moral training systems, such character transformation could not be sustained. Moral values of honesty, uprightness, truth and knowledge were discarded in the new educational and social reconstruction. It is true that without that moral training which maulana emphasised, Islamic character development was not possible. He appeared to be contrasting the Islamic and un-Islamic models. In Islamic teaching systems, training of individuals led to transformation in society. Islamic values were based on faith; faith emphasised virtue, whereas the un-Islamic colonial system required success. It did not emphasise nurturing of individual character. Collective character was slowly undone through change in education and economic system. That led to educational decay, and moral decline. Here maulana was right that without moral education, Islamic system was impossible to implement.

He then went on to talk about stages in establishing Islamic system of governance. The first stage he talked of was to invite people to introduce them to Islamic morality. This was his response to a question about coercion. Interviewer asked him about the use of state force to implement Islamic system.

Here that veteran historian and scholar responded that the invitation of virtue was the first step. He said that this would be inviting people to speak the truth; to do justice; to be good; and to be fair; and not to usurp; and to treat the poor of the community well; and to treat everybody with respect; in line with Islamic social behaviours. His opinion was that invitation to moral transformation through the message of improvement and nurturing of personality, was the first step toward establishing Islamic society.

He believed that in every street, in all communities, people should be sent to teach core moral and ethical Islamic principles. People should be introduced to Islamic truths of good behaviour; good community interaction; being respectful so, there was cooperation and collaboration; and that there should be no assertion or force used, at this stage.

Once people's value systems were retrained and refreshed in Islamic morality, Islamic system could be established in stages. In there, he emphasised the use of media; that it should be used for training of citizens in principles of Islam. After establishing moral systems and transforming character, next step was introduction of Islamic economic system. After that, introduction of Islamic justice system.

In his sequence of implementation of Islamic society, the first was people's education. So, they would believe in fair-play; justice; equality; honesty; truthfulness; kindness; compassion; charity; cooperation; collaboration; selflessness and consideration. Once all subscribed to these values, then Islamic economic system would be introduced. This was characterised by life spent in society that did not exploit people; did not charge interest; no financial exploitation; honest commerce; truthful trade; fair profit; economic justice system where all paid due taxation; gave charity. Although Maulana did not mention it specifically, these were all steps towards an Islamic welfare state. Once, Islamic economic system was in place, Islamic judicial system could be introduced. He emphasised gradual and organic change, slow and considered, after thorough training and teaching of people. Islamic judicial principles could be applied in civil and criminal matters, gradually. In that, his expansion did not specifically mention concept of equity. In Islam, equality of opportunity are key factors, but that was deemed inherent in the overall theme of his narrative.

He believed that extinction of bad behaviours that were debauch and behaviours that led to immorality and lechery was essential through education and training. Invitation to virtue and conversion in personality were first evolutionary steps. In his four-stage model, starting education with kindness to transform morality; then gradual transformation of economy; then transformation of justice system; then, and only then, if some did not behave in accordance with taught norms, system of Islamic punishments would be implemented.

In response to a question on democracy, if it was Islamic, maulana Mawdudi gave an interesting answer. He said that obviously the starting point had to be from where we were. He believed that it was the principle of democratic adult franchise, based on democratic representative system, that one could bring about this transformation of building an Islamic Society akin to the state of Medina. He said that this could be established only if there were free and fair elections. He was convinced that no one could establish Islamic systems where elections were corrupted, unfair, and unrepresentative, where corrupt people voted for corrupt candidates. If the corrupt won, the dishonest voted, how would that implement Islamic government? His suggestion was that in the first instance all corrupt and dishonest people should be removed from running as candidates. Participation should only be for honest and uncorrupted people.

Only honest and virtuous could gradually improve the system. Gradually remove and replacement dishonest with honest and corrupt with virtuous people, he said. He believed that democratic elections were an essential process, and a series of democratic elections were required, alongside teaching morality, leading into economic changes, leading onto judicial change, would achieve this ultimate aim.

Transformed individual would make good Islamic voter; who would choose a pious Islamic representative; who would be educated, honest, decent, law abiding and virtuous. He believed that this system should carry on until all aspects of individual character building, economic change and judicial changes were achieved. He had one caveat though. He believed that although there was a desire in the populace that Islamic systems should be implemented immediately; and Maulana believed that there was great deal of understanding of many Islamic principles; at the same time, he was convinced that morality of the population, and ethics of politicians were not Islamic. He believed population and politicians to be corrupt. He was convinced that people's ethics were low. As a result, he believed that until moral transformation was achieved, Islamic system could not and should be established. His logic was simple: corrupt will corrupt all systems.

He believed that a corrupt law enforcement institution could never implement Islamic laws with honesty. He gave an example of his time: that police were adept at lodging false criminal cases against innocent people. If that were the case, how could one imagine implementing Islamic laws? It was clear that character of those who implemented and of those who were citizens, if dishonest and disingenuous, would only lead to corruption. He believed that that would be cynical mockery of Islam.

He then moved on to suggesting that the illiterate and uneducated should be educated; literacy improved; and children should be taught the Quran. Children should be able to read and understand principles of Quran. The uneducated and illiterate should also be taught so they were able to understand Quran; learn Islamic principles.

He believed that to start, simple Quranic messages about good behaviours and avoidance of sin should be publicised. For example, the sin of murder should be publicised as one great sin in Islam. Such messages from the Quran should be transmitted to all in simple terms, so people were introduced to the Quranic messages on morality in behaviour. He seemed to suggest that simple messages should be taught first. Simple messages from

the Quran that should be communicated widely and repeatedly. He believed that there should be a massive campaign against corruption. People should be consistently educated about corruption.

He made an important point: there should be intellectual awareness to understand why should there be an Islamic system? This required a detailed discussion for another time, and that was not the case in this interview.

He also suggested that labourers and farmers who believed that socialism and communism would protect their rights, should be taught farmer-protective and labour-protective concepts of Islamic economic system. Here, I believe, he was addressing a contemporary challenge that his Islamic party after having faced a bad electoral defeat in 1970 elections, he had no labour-focused or farmerfocused policies of note. 1970 elections had seen left wing ideology of Peoples

Party led by Mr Zulfiqar Ali Bhutto, using the slogan of Islamic socialism, sweep the polls, and capture the imagination of the masses.

When maulana Mawdudi specifically mentioned labourers and farmers in his interview of 1977, it was when Mr Bhutto had been toppled. It appeared that Maulana was making a remedial correction about something that he did not address earlier, before the elections of 1970.

He firmly believed that an ideal Islamic system could only be brought about through gradual, step by step processes, at a steady pace. He repeated that education systems should incorporate Islamic education, piecemeal. Similarly, judges should be trained and gradually taught how to use Islamic laws and Islamic jurisprudence in adjudicating cases, piecemeal. That gradual, multi layered process would see transformation in society overtime. That would lead to Islamic state akin to that in Medina.

He believed that it was important that people should dedicate their lives to holy Prophet may peace be upon him; but, for goodness' sake, he said, please listen to what he had said.

Maulana Mawdudi summarised his formula for this transformation: gradual increase in one, and gradual decrease in the other.